سانپ اور سیڑھیاں
سلیم شہزاد

سانپ اور سیڑھیاں

سلیم شہزاد

منظر نما پبلشرز، مالیگاؤں

اس ناول کے تمام کردار و واقعات فرضی ہیں۔
ان سے کسی بھی قسم کی مطابقت کو محض اتفاقی سمجھا جائے۔

سال اشاعت	:	۲۰۱۰ء
تعداد	:	۵۰۰
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	(کارواں کمپیوٹر: 92226931304)
ناشر	:	منظر نما پبلشرز، مالیگاؤں
زیر اہتمام	:	عاصم فیت والا
سرورق	:	سہیل اسلم، ناسک
طباعت	:	اقصیٰ آفسیٹ پریس، مالیگاؤں
قیمت	:	۱۵۰ روپے

رابطہ

منظر نما، ۳۲۳، منگلوار وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

فون : ۰۹۸۹۰۳۳۱۱۳۷

سانپ اور سیڑھی کھیلتے ہوئے
یگ بیت گئے
اس کھیل میں
سیڑھیاں چڑھ کر آسمان پر جاتے
کون خوش نہیں ہوتا
اور سانپوں کی رسیوں پہ چل کر
سر کے بل پستیوں میں آتے
کس کو خوشی ہوتی ہے
مگر مل گیا ہے ہمیں ایک لوڈو
اور ہم چل رہے ہیں اپنی اپنی چال

ایک چھوٹی سیڑھی چڑھو
دو لمبے سانپ اُترو
ایک لمبی سیڑھی چڑھ کر
جا پہنچو پہاڑ کی چوٹی پر
چار لمبے سانپ اُتاروں سے
جا اُترو اندھی کھائی میں
کسی کا کمال کمال نہیں
کسی کا زوال زوال نہیں
یہ سب کھیل ہے لوڈو کے بے حقیقت نقطوں کا
(کیا واقعی بے حقیقت ہیں یہ نقطے؟)

یگ بیت گئے
مجھے سیڑھیاں چڑھتے، سانپ اترتے
یگوں لمبی اس یاترا میں
موٹے اور لمبے ہو گئے ہیں سانپ
اور چاٹ گئی ہے دیمک سیڑھیوں کو
اور ہمیں دیا گیا لوڈو
ہے ابھی ہمارے ہاتھ ہی میں
چال چلنا تیری مجبوری ہے
چال چلنا میری مجبوری ہے
سانپ اور سیڑھی کھیلتے ہوئے
یگ بیت گئے ...... بیتے جا رہے ہیں

نقطوں سے قلم کی مہرہ بازی

یوں لاتی ہے رنگِ بدطرازی کہ ادب کسی خارجی دباو کے تحت زندگی کے حقائق کو سفید و سیاہ کے علاوہ دوسرے رنگوں میں بیان نہیں کرتا یا ان کے ساتھ اور رنگوں کو ایسی غیر ہم آہنگی سے آمیز کرتا ہے کہ تصویر سے خرابی کی صورت ظاہر ہوتی ہے اور منظر و پس منظر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ فنکار کا اظہار محض خارجیت کا بیان بن جاتا ہے یا ذات کی گہرائی سے آنے والی آواز جو سننے والوں تک نہیں پہنچتی اور یہ دونوں انتہائیں فنی تقاضوں سے بے نیاز گزر جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ کسی بھی عہد کے ناول کا بیانیہ، فن سے صرفِ نظر کو روا نہیں رکھتا اور ناول کے فنی تقاضے ظاہر ہے کہ دیگر بیانیہ اصناف کے تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ افسانے کے بیان میں شاعری کی آمیزش کو بعض ناقدین نے پسندیدہ بھی قرار دیا ہو تو شاعری افسانے کا فنی تقاضا نہیں۔ وسیع تناظر میں اسی کو ناول میں شعریت یا بالصنف نظموں کی شمولیت کے مترادف کہا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ سو صفحات کے نیم تجریدی نیم حقیقی نثری بیان میں پچاس ساٹھ طویل نثری نظمیں شامل کر دی گئی ہیں اور ناقد اس صورت کو اس لیے جائز اور قابل قبول بتا رہا ہے کہ کسی فرانسیسی/ انگریزی ناول میں اس نے نظمیں چسپاں کی گئی دیکھی ہیں۔

میں نے اپنے پہلے ناول ''دشتِ آدم'' کا نثری بیانیہ کہیں کہیں نظم کی چھوٹی بڑی سطروں میں لکھا تھا۔ زبان بھی اس کی شعریت سے معمور تھی، کسی ناقد کو توفیق نہ ہوئی کہ افسانے اور شاعری کی ٹوٹتی حد بندیوں کے حوالے سے اپنی گراں قدر آراء کا اظہار کرتا۔ میرا دوسرا ناول ''ویرگا تھا'' شعریت سے عاری، افسانوی نثر کی شفافیت کا حامل اور طریق اظہار میں ناول کے فنی تقاضوں کو برت کر لکھا گیا ہے۔ قارئین (جواب مابعد جدیدیت کے عہد میں معنی کشا کا کردار ادا کر رہے ہیں) اس کے نثری بیان کو بے رس، مشکل اور اعداد و شمار کی روداد کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ سیاست اپنے کسی مقصد کے حصول کے۔لیے ادب وفن کو اپنے کل پرزوں کے نظام میں کہیں بآسانی کھپا دیتی تھی، اب ادب وفن آپ ایسے ادارے بن چکے ہیں جن کی اپنی سیاست ہے اور اس کی گروہ بندیوں کے مخصوص افکار وتصورات اور طریقہ ہائے کار بھی پائے جاتے ہیں۔ سیاسی ادبیت اور ادبی سیاست کا یہ تال میل اگر افسانوی بیان کا حصہ بنتا ہے، جیسا کہ زیرِنظر ناول میں آپ دیکھیں گے تو مصنف یا بیان کنندہ یا ناول کے راوی کے لیے شعریت اور اظہار و ہیئت کی تجرباتی سرگرمیوں سے صرف نظر لازمی ٹھہرے گا۔ اس ناول کا عنوان ''سانپ اور سیڑھیاں'' تمثیلی/ علامتی معنویت ضرور رکھتا ہے لیکن شعریت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ (میں شاعری اور افسانے کی علامتوں میں معنوی تفریق کا قائل ہوں) اکثر کھیلوں میں تاثر و تجسس کی کیفیت کھیل کے اختتام پر ہار جیت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے لیکن سانپوں اور سیڑھیوں کے کھیل میں ہر چال کھیلنے والوں کو ہر لحہ غیر متوقع عروج یا زوال کے تجربے سے دوچار ہونے کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف سیاست کی بلکہ زندگی کی بازی کا بھی اعلامیہ ہے کہ اس کے کردار کبھی کھلاڑی اور کبھی بساط کے مہرے بن جاتے ہیں۔

اس ناول کا بیانیہ ماحول کی واقعیت سے گریز نہیں کرتا۔ اس کے کردار اپنے ماحول کی مخصوص زبان بولتے اور تہذیبی، لسانی اور علاقائی غیر یکسانیت کے باوجود ایک ہمہ گیر ثقافتی منظرنامے کا حصہ بنے رہتے ہیں جس پر مخصوص سیاسی، مذہبی اور فکری رنگوں کی چھوٹ نمایاں ہے۔ سیاست اور ادب کے باہمی رشتے سے جو صورت حال ناول میں ظہور کرتی ہے، اس میں

ایک سیاسی چال کو کامیاب اور دوسری کو ناکام ہوتا دیکھا جاسکتا ہے لیکن سیاستدانوں کے ذریعے فن اور فنکار کا خریدا جانا یا فنکار کا اپنے آپ کو بیچ دینا، اسے عصری ادبی سماجیات کی صارفیت گزیدگی کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

عالمی سیاسی صورت حال پر جو ایک خاص رنگ چڑھ گیا/ چڑھا دیا گیا ہے، ''سانپ اور سیڑھیاں'' میں اسے واقعات کو متحرک کرنے والے عامل کے امریکی کردار میں دیکھا جاسکتا ہے اور فنی تقاضے کے مطابق یہ ایک تمثیلی/ علامتی ساختیہ بھی ہے جسے راوی نے کہیں تو بطور حقیقی کردار اور کہیں فرضی کرداروں کے ساتھ روبعمل دکھایا ہے۔ یہی کرداری کیفیت ناول میں متعارف ادیبوں کی بھی ہے جنھوں نے ناول کے فرضی کردار تخلیق کیے ہیں لیکن کبھی کسی فرضی کردار کے ساتھ بھی کوئی ادیب دکھائی دے جاتا ہے مثلاً اوما چوہان لوک کلا کار موہنی ہرداس کے ساتھ۔

ناول کے سارے اہم واقعات اپنی زمانی اور مکانی حدود میں ایک دوسرے سے کسی ربط کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں لیکن چونکہ اس کے تمام کردار ایک خاص سیاسی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں ان کا کردار مہیا کرنے والے عوامل یعنی سیاست کے ہاتھوں بک جانے والے ادیبوں نے ایک مخصوص حاوی فکر کے تحت تخلیق کیا ہے (اور ان سب سے قطعی غیر متعلق ناول کا راوی انھیں کسی صورتِ واقعہ میں حقیقی اور کسی میں فرضی کرداروں کی طرح بیان کرتا ہے) اس فنی تکنیکی انضمام کے سبب ناول ''سانپ اور سیڑھیاں'' کے فرضی کردار جو دراصل کھاڑی میں پھینک دیے گئے ناول (کتنے ہندوستان؟) کے حقیقی کردار ہیں، اصل پر نقل کی یا نقل پر اصل کی انطباقی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح دریا برد کر دیے جانے والے ناول کی بساط سانپوں اور سیڑھیوں سے کھیلے جانے والے کھیل کی بساط بن جاتی ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی کرداروں کو ایک ہی منچ پر اپنی اپنی چال چلتے، بساط کے خانوں میں مہروں کی طرح حرکت کرتے، سیڑھیاں چڑھتے یا سانپوں کا نوالہ بنتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

ہر سماجی ادارے، سیاسی حلقے، ادبی گروہ اور افراد کے باہمی ربط ضبط کے ہر وقوعے میں ایک مخصوص زبان یا بولی استعمال کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانیں بولنے والے

کرداروں کو اس ناول میں یکجا کر کے بیانیہ کے اسی تنوع کا تجربہ کیا گیا ہے۔ کنڑا کے دو تین جملوں کے لیے بنگلور کے افسانہ نگار یوسف عارفی اور بنگالی رسمی جملوں کے لیے کلکتہ (بلکہ کولکاتا) کے شاعر معصوم شرقی نے میرا تعاون کیا ہے، میں دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ ماہنامہ ''پیش رفت'' (دہلی) میں ناول کی چند قسطوں کی اشاعت نے اسے اردو قارئین کے ایک بڑے حلقے سے متعارف کرایا، رسالے کے اربابِ بست وکشاد کا شکریہ۔ ''شیش'' (جودھپور) کے لیے بھی اظہار تشکر کہ اس ناول کی قسطیں دیوناگری میں شائع کر کے اس نے میرے کام سے ہندی والوں کو یا میرے کام کو ہندی والوں سے آشنا کیا۔

امید ہے قلم کی مہرہ بازی سے بدطرازی کے رنگ آنے تک بعض گوشے قارئین با تمکین پر واضح ہو گئے ہوں گے، اب معنی کشائی کی اگلی چال آپ کی ہے۔

مصنف

باب : ا

اشوکا ہوٹل کے لاؤنج میں اس وقت ملک اور بیرون ملک کے بڑے ادیبوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ان کے علاوہ تمام راجیوں سے آئے ہوئے وپکش کے اہم نیتا اور حکمراں پارٹی کے بھی کچھ ویسے ہی اہم سیاسی رہنما اس تقریب میں چمک رہے تھے، موقع تھا شری اوم کتھائی کے ناول ''مہابھارت کی کھوج'' کی رونمائی کے فنکشن کا۔

کیمروں کے فلیش، اچانک اجالے اچانک اندھیرے، روشنی اور سایے کا کھیل، اشوکا کے اونچے اونچے درختوں میں جھلملاتے رنگین قمقمے اور دو دو چار چار کی ٹولیوں میں ادھر ادھر کھڑے یا کرسیوں کا حلقہ بنائے بیٹھے فنکار اور سیاستداں ان سب کے بیچ ہوٹل کے مؤدب بیرے ٹریز اور ٹرالیوں میں کھانے پینے کے لوازمات ادھر ادھر کرتے ہوئے، مردوں عورتوں کی ملی جلی آوازوں کا شور، دھویں میں ملی جلی خوشبوئیں، شیشوں کی کھنک میں ملی جلی نقرئی ہنسی۔

کتھائی بالوں سے بوڑھا لیکن اپنے ہاؤبھاؤ سے ایک کھلنڈرا شخص تھا۔جس خاندان کی کہانی اس نے اپنے ناول میں لکھی تھی، کچھ ہی عرصہ پہلے وہ اسی کی سیاسی پارٹی کا ایک اہم رکن اور حکومت میں حصے دار رہ چکا تھا۔آپس کی ناچاقی سے لیکن اب وہ وپکش کا طرفدار ہے، وپکش جس میں شامل ہیں سنگھ اور سنگھ کے بہت سے نامی نیتا اور گیانی اور کلاکار اور دھرمادھکاری۔

اچانک کتھائی اور اس کے ساتھ کچھ اور کھدّر پوش لاؤنج میں داخل ہوتے ایک ٹولے کی طرف لپکے اور اس ٹولے میں وپکش کے بڑے بڑے نیتا، دھرم گرو جن وغیرہ تلک دھاری لال پیلے

انگوچھے لپیٹے وِموچن سماروہ میں اپنی اُپستھی کے لیے پدھار رہے تھے۔ اس وقت کچھ لوگوں نے ''جے شری رام'' کے نعرے بھی لگائے اس ٹولے کے سواگت میں۔ زندگی اور جوش وخروش کی ایک عجیب سی لہر لاؤنج میں دوڑ گئی۔ گھنٹیاں بجانے والی ہنسی کو جیسے چپ لگ گئی مگر ایسے ہی میں کہیں سے زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ کسی شریمتی کا اندھیرے میں روشنی کر گیا۔

بھگوا رنگ کے میز پوش سے ڈھکی اور گیندے گلاب کے ہاروں سے سجی لمبی میز کے بیچ کتھائی کے ناول کی کچھ جلدیں سنہرے پنّوں میں پیک رکھی تھیں اور گلابی ربن بندھے اس بنڈل پر چاندی کی تشتری میں سونے کی ایک قینچی۔ ایک دھرم گرو کے کمل کروں سے دیپ جلائے گئے۔ منچ پر کتھائی کے سوا کوئی دوسرا لیکھک دکھائی نہ دے رہا تھا۔

وموچن کے بعد ناول کے کئی نسخے نیلام کیے گئے جن سے ملنے والی دھن راشی کتھائی نے کھلے دل سے ملک میں چلائی جا رہی ایک سناتن دھرم ودیا پیٹھ کو ارپت کر دی۔ ناول کی کئی سو جلدیں وہیں منچ پر اور سماروہ میں آنے والوں میں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ لاؤنج سے ہٹ کر لگائے گئے اسٹال پر ناول کی مزید سیکڑوں جلدیں خریدنے کے لئے لوگ قطار لگائے بھی کھڑے نظر آئے۔ کتھائی کی ہدایت کے مطابق کتاب کے کئی بنڈل ملک بھر میں تقسیم کرنے کے لیے پہلے ہی روڈ اور ریلوے ٹرانسپورٹ کے دفتروں میں بھیج دیے گئے تھے۔

''مہا بھارت کی کھوج'' نہ صرف چار گنی اور دس گنی قیمت پر بلکہ نصف اور چوتھائی قیمت پر بھی بیچی گئی۔ یہاں تک کہ بعض تعلیمی، مذہبی اور سماجی میلوں کے موقعوں پر اسے ملک کے مختلف حصوں میں مفت ہی بانٹ دیا گیا۔

اسی رات اوم کتھائی نے دوردرشن پر اپنے انٹرویو میں کہا:

''ایک ہی پریوار کے سدسیوں کا راج ہم نے اس دیش میں سو سو دو دو سو ورشوں تک جھیلا ہے اور آج سوتنترتا کے پشچات بھی ہم اسی دردشا میں پڑے ہیں۔ کہنے کو تو دیش میں لوک تنتر آ گیا ہے کنتو یہ سچا لوک تنتر نہیں۔''

''سچا لوک تنتر آپ کسے مانتے ہیں؟'' پوچھا گیا۔

''اس دیش کی پراچین سبھیتا اور منوسمرتی میں سنگھٹت کیے گئے ودھان پر بنے رام راجیہ کو''

''آج کے آدھونک یگ میں رام راجیہ کس طرح ستھاپت کیا جا سکتا ہے؟''

''رام راجیہ کی ستھاپنا کے لیے......''

ٹی وی پر نظر آنے والا کتھائی کچھ اور کہتا لیکن اسکرین پر اچانک لہریں سی دوڑنے لگیں اور ایک لمحے بعد ''رکاوٹ کے لئے کھید ہے'' کے الفاظ نظر آنے لگے۔

کتھائی کا انٹرویو دیکھنے والوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ بار بار وہ ٹی وی کی طرف دیکھتے اور ہر بار کھید کا لفظ وہاں لکھا نظر آتا۔

''بند کرو یار'' کتھائی جھلا گیا، ''جب تک یہ کانگریس والے دیش پر راج کریں گے، کسی کو اپنے ورودھ بولنے کی آگیا نہ دیں گے۔ سالوں نے چھوٹے چھوٹے سماچار پتروں کو تو نہیں چھوڑا اور بات کرتے ہیں سوتنتر پریس کی۔''

''ریڈیو، ٹی وی، فلم...... ہر جگہ تو انھی کا راج ہے'' کوئی بتانے لگا، ''اپنے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے یہ لوگ۔''

''کتھائی جی'' کوئی اور بولا، ''آپ بتانے جا رہے تھے کہ آج کے یگ میں رام راجیہ کیسے لایا جا سکتا ہے؟''

''اس کے لیے تو پہلے سم ودھان کو بدلنا پڑے گا بھائی'' کتھائی سنجیدگی سے کہنے لگا، ''اور جانتے ہو، اسے بھی انھیں لوگوں نے بنایا ہے بلکہ ان کے ساتھ ایکتا کے نام پر کئی جاتیاں جٹی ہوئی تھیں جنھیں ہمارا منوواد سویکار نہیں کرتا۔''

''آپ بھی تو مہاشے کبھی اس پارٹی میں اونچا ستھان رکھے تھے۔''

کتھائی نے بولنے والے کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ان نظروں سے بے پروا کہے جا رہا تھا، ''آپ کو پارٹی بدلنے کی ضرورت کیوں آ گئی؟''

''یہ پارٹی کیا ہے؟'' کتھائی بولا ''اس کے لوگ کل کیسے تھے اور آج کیسے ہیں؟ جنتا کے پرتی اس پارٹی کے مگرمچھوں کے وچار کیا ہیں اور یہ دیش کے ساتھ کیا کر رہے اور کرنا چاہتے ہیں، ان سارے پرشنوں کا اتر میں نے اپنے اپنیاس میں دیا ہے، اسے پڑھیے۔''

''کتھائی جی'' کسی نے آواز دی، ''اپنیاس کاری اور کتھا کتھن جیسے کام تو ساہتیہ کے کشیتر کی

چیزیں ہیں، آپ کو ان کاموں کا پہلے سے کیا انوبھو تھا؟''

''یہ اپنیاس جو ہم نے لکھا ہے'' کتھائی نے جواب دیا، ''اس کا بڑا حصہ ہماری جیون لیکھا پر آدھارِت ہے، اپنے پرشن کا اتر آپ وہیں پا سکتے ہیں اور بہت اچھی طرح......''

''جرائی وی آن کرنا یار''، تبھی کسی نے بات کو موڑ دینے کی کوشش کی، ''دیکھو تو کتھائی جی وہاں کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ابھی تک رکاوٹ پر کھید کا اعلان چل رہا ہوگا۔''

بٹن دبانے کی آواز کے ساتھ اناؤنسر کی آواز آئی، پھر اس کی صورت بھی دکھائی دی۔

''تو یہ تھے شری اوم کتھائی جی، ہمیشہ کے بڑے راج نتگیہ اور آج کے بڑے اپنیاس کار''

''بدھائی ہو'' ہال میں موجود کوئی بول اٹھا، ''کانگریس سرکار نے آپ کو بڑا اپنیاس کار مان لیا۔''

ہنسی قہقہوں کے بیچ کتھائی ''مہابھارت کی کھوج'' اپنے دوستوں اور مہمانوں کو پیش کرنے لگا۔

''ناول کے نام پر بھی ایک بہت بڑے کانگریسی کی کتاب کے نام کا اثر ہے۔'' سوچتے ہوئے آلوچک نے ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی کتاب کو ایسے کھولا گویا ذرا دباؤ پڑا اور پنے بکھرے۔ اس کی خاموش کلامی جاری رہی، ''کل تک یہی آدمی حکمراں پارٹی کے کن گان میں سب سے آگے تھا اور ہائی کمان کا حصہ بھی۔ آج اتنا چڑا ہوا ہے اپنے لوگوں سے کہ پارٹی بدل کر ایک انتہا پسند ٹولے میں شامل ہو گیا ہے۔ گھر کا بھیدی چورا ہے پر گھر والوں کی عزت سے کھیلے، اس کے سوا اس ناٹک یعنی اس ناول کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' وہ کھڑکی سے قریب رکھی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور ادھر ادھر سے کتاب میں چھپی سطروں کو دیکھنے لگا۔ پھر کتاب بند کر کے اس نے اس کے سرورق کو خوب اچھی طرح نہارا دونوں طرف سے۔ جی ہی جی میں اس کی تعریف بھی کی اور پہلے صفحے سے ایک ایک لفظ پر نظریں دوڑانے لگا۔

اسے یاد آیا کہ اسی اشوکا کے لاؤنج میں پچیس سال پہلے اوم کتھائی کے ناول کا وموچن سماروہ بڑے اتساہ سے منایا گیا تھا۔

''ہاں'' اس نے سوچا، ''ناول کے نام پر میں نے خود کھتائی جی سے کہا تھا کہ یہ جواہر لال نہرو کی کتاب پر بنے ٹی وی سیریل ''بھارت ایک کھوج'' سے بہت ملتا ہوا ہے۔ مہا بھارت کی کھوج میں شریمان آج پتا نہیں کہاں گم ہو گئے۔ پارٹیاں بدلتے بدلتے کون جانے کس سیڑھی سے کہاں چڑھ گئے یا شاید کسی اجگر نے انھیں ہڑپ کر لیا۔''

فلمی گیت لکھنے والے ایک مہا کوی کی گجل البم کے ادگھاٹن میں کبھی کا ہندی لیکچرر اور ساہتیہ آلوچک اور آج کا کانگریسی نیتا بالمکند ناگر فنکشن میں مکھیہ آتتھی کی جگہ براجمان تھا اور ایک زمانہ پہلے کی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ انہیں باتوں کی لہر میں اس نے کلا میں روچی رکھنے والے کانگریس ہائی کمان کے کچھ لوگوں کے نام بھی یاد کیے اور ایک منصوبہ اس نے تیار کیا ساہتیہ اور ساہتیہ کاروں کو راج کارن میں استعمال کرنے کا۔

''یہ ٹھیک سے پرسنگھ پریوار کو جواب بھی ہوگا'' اس نے سوچا، ''انھیں کے ہتھیار سے انھیں کو جواب۔ مہا بھارت کی کھوج کے نئے راستے آج بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔''

فنکشن کے بعد ناگر نے وہیں کچھ ادیبوں اور نیتاؤں کو روک کر ایک کارنر میٹنگ لے ڈالی اور ادب، سیاست اور حقیقت کے تال میل سے تیار کیا گیا ایک بلیو پرنٹ: ملی جلی حکمراں پارٹی کے خلاف بے اعتمادی پھیلا کر اس کا تختہ الٹنے کا (اگر ممکن ہو سکے)

دنیا بھر کے اخباروں، رسالوں اور ٹی وی چینلوں وغیرہ نے اس واقعے پر طرح طرح کی کہانیاں تیار کر کے اسے گھر گھر پہنچا دیا تھا اور اپنی ہر کہانی کو مختلف شکلوں میں وہ اب بھی رہ رہ کر دیکھنے سننے والوں کے ذہنوں تک پہنچائے جا رہے تھے۔ محلوں سے جھوپڑوں تک اور لیڈروں سے مزدوروں تک، سب کی زبانیں اسی ایک واقعے پر الفاظ خرچ کر رہی تھیں۔ واقعہ جس پر بیتا تھا، اب اس کا نہ رہ کر ہر اس فرد کا واقعہ ہو گیا تھا جو اس پر الفاظ خرچ کر رہا تھا۔ خبریں کہانیاں انٹرویوز، مباحثے (کئی زبانوں میں ڈب کیا گیا) ٹی وی سیریل، ہالی ووڈ اور بالی ووڈ میں اس واقعے پر بنائی گئی فلمیں اور آرٹ اکادمی آف پیرس میں تیار کیے گئے ڈرامے، سبھی کا موضوع بن گیا تھا یہ واقعہ۔

ہوا یہ تھا کہ

ہُوا تو کچھ بھی نہیں تھا لیکن کچھ بھی نہ ہو کر جیسے کبھی کبھی بہت کچھ ہو جاتا ہے، اسی طرح اس واقعے میں بھی کچھ نہ ہوا تھا، بس میڈیا والوں نے اسے بہت کچھ بنا دیا تھا کہ یہ لوگ رائی کا پربت بنانا خوب جانتے ہیں (ویسے جو رائی پربت بننے کی اہلیت رکھتی ہے، اس کی اہمیت کچھ تو ضرور ہونی چاہیے) چنانچہ جس پر یہ ہونی گزری تھی۔ ایک صبح خود اس نے جب اپنے اغوا کر لیے جانے کی خبر پڑھی تو ایک پل کے لیے اسے اپنا ہی گھر اجنبی سا ضرور لگا تھا لیکن دراصل ہوا یہ تھا کہ ممبئی آگرہ روڈ پر تھانہ میں بنائے گئے ایک فلائی اوور برج کے ادگھاٹن کے پروگرام میں آکاش اینڈ آکاش بلڈرز کے ٹھیکے دار نے شہری وکاس منتری کو سرخ ربن کاٹنے کے لیے جب سونے کی قینچی پیش کی تو اسے نو تعمیر پل میں استعمال کیے جانے والی ریت اور سیمنٹ کی غیر مناسب ملاوٹ کا خیال آ گیا، پل اسے ڈگمگاتا ہوا محسوس ہوا اور

لیکن وزیر اپنا کام کر چکا تھا اور جو کچھ ہوا وہ ادگھاٹن کے ایک زمانے بعد ہوا البتہ اس پروگرام میں شامل چیف انجینئر نے ربن کاٹے جانے کے لمحوں میں اپنی بیوی کے متعلق سوچا کہ وہ اس کے اسسٹنٹ کے ساتھ فرار نہ ہو گئی ہو۔ تب وہ اچانک کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ایسا کرنا اسے خاصا شاؤنگ سا بھی لگا مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بار بار کی لٹی پٹی پشپا نگر کر کو میونسپل الیکشن میں جیتنا تھا سو وہ جیتی اور مختلف جوڑ توڑ سے اکثریت بنانے والی پارٹی میں شامل ہو کر اس نے لاکھوں بنائے جبکہ کچھ ہی دنوں پہلے وہ پچیس پچاس روپے میں اپنا گوشت بیچتی پھرتی تھی اور آج واقعہ یہ ہے کہ

آگ اتنی پھیلی کہ آس پاس کے سارے گاؤں اور شہر اس کی لپیٹ میں آ گئے، یہاں تک کہ ایک مقامی سیاسی پارٹی کے مقامی اخبار کے ایڈیٹر کو محض اس لئے نوکری سے نکال دیا گیا کہ اس نے کئی بار الیکشن ہارنے کے بعد مشکل سے جیتنے والے پارٹی لیڈر اور ریاستی اسمبلی کے غیر اہم رکن کی ایک تصویر لیڈر موصوف کا نام دیے بغیر شائع کر دی تھی اور تو اور پانچ سو صفحات پر چھاپے گئے اس ناول کی پچیس ہزار جلدیں ماہم کی کھاڑی میں پھینک دی گئیں جس میں اغوا کیے جانے والے یا فلائی اوور کی تعمیر میں گھپلا کرنے والے یا شوہر کے اسسٹنٹ کے ساتھ بھاگ جانے والی یا اپنا گوشت بیچنے والی کارپوریٹر یا عصمت دری کے بعد مقتولہ کے اعضاء تھیلے میں بند رکھنے والے یا

کوئی کہاں تک گنائے صاحب، ایک ہزار ایک کہانیاں تھیں جو پچیس ہزار کے ایڈیشن میں چھپے

اس ناول کو عصری زندگی کے ادب العالیہ کا مقام دے سکتی تھیں، ایک نامعلوم شخص نے راتوں رات اس کی تمام جلدیں دگنی قیمت میں خرید کر کھاڑی کے بدبودار پانی میں پھنکوادیں مگر قصہ ختم نہ ہوا کہ ہر قصہ آسانی سے ختم بھی نہیں ہوجاتا اس لیے پریس سے کسی طرح اس ناول کی ایک جلد ریاستی اسمبلی اور وہاں سے ملکی پارلیمنٹ تک جا پہنچی۔ قومی نشریات میں صبح گیارہ بجے کے پروگرام میں ممبران پارلیمنٹ کی دھما چوکڑی کو لاکھوں عوام نے دیکھا۔ اسے دیکھ کر بہت لوگ ہنسے اور بہت سے لوگ رو دیے۔ پھر میڈیا والے اس شخص کی تلاش میں نکل پڑے جس نے وہ ناول دگنی قیمت میں خریدا اور کھاڑی میں پھنکوادیا تھا۔ کلاسک پرنٹرز کے مالک نے خریدار کا نام پتا بتادیا جو مارواڑی چال کی دیوار سے لگ کر فٹ پاتھ پر رہنے والے کباڑیوں میں سے ایک معمولی کباڑی تھا جس کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ ناول کی پچیس ہزار جلدیں ردی ہی میں سہی، ناول کی دگنی قیمت میں خرید سکتا۔ سو اس نے ایک اور شخص کا نام بتادیا کہ میرا کام تو صرف بائنڈر کی دکان سے کتابیں اٹھا کر سمندر میں پھینکنے تک تھا۔ ردی کی قیمت پریس والے کو دادر کے ایک ملکانی سیٹھ نے ادا کی تھی۔

''مہانگر سماچار'' کا رپورٹر اجے شرما اس پتے پر پہنچ کر اپنی بائک سے ابھی اتر ہی رہا تھا کہ اس کے پیچھے سے آکر ایک پولس وین ذرا آگے، زور سے بریک لگا کر رکی۔ کچھ وردی پوش اس میں سے اترے اور دوڑتے ہوئے اس کئی منزلہ عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھے، ملکانی سیٹھ سے ملنے کے لیے جس کے ایک فلیٹ کا پتا اجے بھی اپنی جیب میں رکھے ہوئے تھا اور اجے کو معلوم نہ تھا کہ پولس والے بھی اسی پتے پر پہنچنا چاہتے ہیں اس لیے تیسرے منزلے پر جب لفٹ رکی تو فلیٹ نمبر پچاس بی کے دروازے پر پولس والے اجے سے پہلے پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبا رہے اور دروازے پر دستکیں بھی دیے جارہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت یا دو چار منٹ آگے پیچھے کھاڑی میں پھینک دیے گئے ناول کا ایک حقیقی کردار رنگ روڈ دہلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی چھت پر بنے سوئمنگ پول میں آٹھ دس جل پریوں کے بیچ گھرا اچھلیں کر رہا اور شراب کے جام پر جام چڑھائے جارہا تھا۔ دھوپ پڑنے سے پانی اور شیشہ اور جل پریوں کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے کالے چشمے چمک چمک جاتے تھے۔ پول کنارے لگی ایک بڑی رنگین چھتری کے نیچے شیشے کی میز پر ایک بریف کیس رکھے فولڈنگ چیئر پر ایک اور حقیقی کردار پول میں

ہوتے تماشے سے لطف اندوز ہو رہا لیکن دراصل وہ جل پریوں میں گھرے مگرمچھ کے پول سے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

مگرمچھ اور جل پریاں اور ان کا تماشا دیکھتا ہوا شخص ناول کے حقیقی کردار ضرور تھے لیکن اہم کردار تھا وہ بریف کیس جس میں رکھی چند فائلیں اور سی ڈیز اپنے اندر چھپائے ہوئے اعداد و شمار، تصویروں اور ہائی تکنیک منصوبوں کے سبب دنیا کے بعض ملکوں میں سیاسی خلفشار، دہشت اور بیماریاں پھیلا سکتی تھیں اور بریف کیس میں رکھا ہوا یہ مال بکا و تھا بلکہ پہلے ہی بیچا اور خریدا جا چکا تھا جس کی سودے بازی کا سارا حال کھاڑی میں پھینک دیئے گئے ناول میں تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ سوئمنگ پول میں رنگ رلیاں منانے اور رنگین چھتری کے سایے میں بیٹھ کر ان کا تماشا دیکھتے کرداروں کو اس تفصیل کی کوئی خبر نہیں تھی۔

اس ناول پر اسمبلی اور پارلیمنٹ میں ہوئی چیخ پکار میں چند نام ایسے ضرور سنے گئے تھے، ملک کی معیشت، سیاست اور صنعت و حرفت کی باگ ڈور جن کے ہاتھوں میں تھی اسی لیے ای میل اور موبائل فون کی تابڑ توڑ بٹن ماری سے ناول کی پچیس ہزار جلدوں کا سودا اگر چہ ردّی کے نام سے لیکن چھپی ہوئی قیمت سے دگنی قیمت دے کر طے کر لیا گیا۔

ملکانی سیٹھ نے گجرات کے بہت سے صنعت کاروں، ٹھیکے داروں اور سود پر روپیا دینے والوں سے دیر تک فون پر باتیں کر کے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔ بات کرنے پر اسے ایک فون نمبر دیا گیا کہ جہاں سے اسے "کتنے ہندوستان؟" نام کے ایک اپنیاس کی تمام جلدیں کسی بھی قیمت پر خرید کر سمندر میں پھینکوانی تھیں۔

ایک پل کے لیے ملکانی کو اس سودے کے حکم پر حیرت ضرور ہوئی لیکن اسے اس کی پروا نہ تھی کہ مجھے کیا حکم دیا گیا ہے البتہ حکم دینے والے کا حکم دینا یا اس سے کوئی خدمت لینا ہی اس کے لیے بڑی بات تھی۔ سو اس نے دیا گیا نمبر ملانے میں دیر نہ کی۔ یہ نمبر کلاسک پرنٹرز کا تھا جہاں سے پبلشر کے نام سے ملکانی کو صوبے کے کسی شہر کا نمبر دیا گیا۔ اس نے فوراً یہ نمبر بھی دبایا اور پبلشر کا نام لیا۔ "رانگ نمبر" کہہ کر فون کاٹ دیا گیا۔ دوبارہ رنگ کرنے پر ملکانی کو بہت دیر تک دوسری طرف گھنٹی بجتی ہوئی سنی پڑی، گویا ادھر فون اٹھانے کی کوئی زحمت ہی نہ کرنا چاہتا ہو۔

اس کا پارہ چڑھنے لگا۔ دل ہی دل میں اس نے کئی گالیاں دے ڈالیں اور ریسیور کریڈل پر پٹخ

دیا لیکن ریاستی وزارت تعمیرات کے سیکریٹری کے حکم کی امل بجاونی (عمل بجا آوری) میں دیر کرنے کو نامناسب سمجھ کر اس نے پھر وہی نمبر لگایا اور دوسری طرف سے ریسیور اٹھتے ہی اس نے بات شروع کردی لیکن کسی کا جواب ملنے کی بجائے ادھر سے بچوں کی چیخ پکار اور گانا بجنے کی آواز آتی رہی۔ ملکانی نے ''ہیلو، ہیلو'' کی رٹ بھی لگائی، نتیجے میں فون رکھ دیا گیا

ہُوا یوں تھا کہ ملی جلی حکمراں پارٹی کے خلاف بے اعتمادی پھیلا کر اس کا تختہ الٹنے کے لیے ملی جلی پارٹی کے دانشوروں نے میڈیا کے ہتھکنڈوں کی طرح ادب اور فنون کو بھی اسی مقصد سے استعمال کرنے کی خاصی اعلا معیاری کوشش کر ڈالی تھی۔ فنکار عموماً حکومت میں مخالف رجحانات رکھنے والے ادارے کو روشن خیال، ترقی پسند اور عوامی فلاح کے لیے مخلص خیال کرتے ہیں چنانچہ اس ادارے میں جو دو چار لکھنے پڑھنے والے، شعر و شاعری یعنی غزل گائیکی اور ناچ گانے سے دلچسپی رکھنے والے ارباب ذوق پائے جاتے تھے، انھیں آگے لاکر ملک کے اہل قلم کو مشاعروں، سمیناروں اور ثقافتی پروگراموں میں مدعو کیا گیا۔ عوامی سطح کے علاوہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی چھتوں پر خصوصی ادبی ملاقاتیں رکھی گئیں۔ انھیں میں ملک کے بعض واقعی سچے فنکاروں کو خرید لیا گیا (وہ بھی شاید بکنے کے لیے تیار ہی تھے یا عیارِ طبع خریدار کو انہوں نے پرکھ لیا تھا) اور ایک دوسرے کے تخلیقی کام سے ایک دوسرے کو بے خبر رکھ کر ملک میں ہونے والے بہت سے اہم اور بہت سے غیر اہم واقعات پر تخیلی رنگ چڑھا دیے گئے۔ پھر ملک کے طول و عرض سے ان حقیقی تخیلی واقعات پر رنگ چڑھائی گئی تصویروں یعنی بے خبری میں بہت سے فنکاروں کی (شاید) ایک ہی قسم کی کہانیوں کو ایک خاص ملاقات میں یکجا کیا گیا (اس ملاقات میں وہاں کوئی فنکار موجود نہ تھا) اور ایک ایک کہانی کو سرکاری یوجنا کی رپورٹ کی طرح پڑھ کر اس طومار میں سے بہت سے ایسے اپی سوڈز منتخب کیے گئے جنھیں سیاسی سماجی وغیرہ مختلف قسم کے شعور رکھنے والے ایک فنکار کے ذریعے ناول کی شکل صورت میں ڈھال دیا گیا۔ ڈی کنسٹرکشن یعنی کتر بیونت اور ری کنسٹرکشن یعنی چسپاں کاری کے ذریعے کولاژ کیے گئے اس ناول کا نام تھا: ''کتنے ہندوستھان؟'' ناول کا ایک مصنف بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ اس ناول کو مختلف ذہنوں اور ہاتھوں نے تیار کیا تھا اس لیے کسی ایک شخص کا نام مصنف کے طور پر ناول کے نام کے ساتھ دینا ناول تیار کرنے والوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ کئی

ناموں پر غور کرنے کے بعد جوڑ توڑ کی مخالف پارٹی کے کسی بھاشا گیانی نے ایک ملا جلا نام تجویز کیا: راج ولاس راج۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ حکمراں پارٹی ادیبوں، شاعروں، بھاشا گیانیوں اور للت کلا کے ماہروں سے کچھ تعلق نہ رکھتی تھی۔ اس نے بھی بہت سے منچ بنا رکھے تھے ان لوگوں کے لیے اور محفلوں اور اکادمیوں میں انہیں اونچے اونچے عہدے بھی دے رکھے تھے اس نے۔ زبان، تعلیم، تہذیب اور ثقافت وغیرہ کی ترقی کے لیے وہ بھی اپنے سیاسی مینی فیسٹو کے مطابق تدریسی نصاب اور تبلیغی اجتماعات کرانے میں کچھ کم رفتار نہ تھی لیکن مخالف پارٹی نے اس سلسلے میں ایسی چال چلی کہ اب مقابل کے لیے کچھ ویسا ہی کر گزرنا مناسب نہ رہ گیا تھا اس لیے ''کتنے ہندوستان؟'' کی تیاریوں کی خبر جب خاص الخاص ادیبوں اور فن کاروں میں سے کچھ نہایت مقرب اعتمادیوں کے ذریعے نشر و اشاعت کے دفتر کے ملازموں اور پھر سیکریٹری تک پہنچی تو پتا چلا کہ ایک غیر ہندی علاقے میں یہ ناول چھپ رہا ہے اور یہ کہ ملک کی دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنے کے لیے ماہرین خریدے جا چکے ہیں اور انہوں نے کام شروع بھی کر دیا ہے۔ الیکٹرونک مواصلاتی تاروں کے ذریعے ایک فیصلہ حکم کے لفظوں میں جب دادر (ممبئی) میں واقع ایسٹ اینڈ ویسٹ انٹرپرائز کے مالک حکم چند ملکانی کے فون سے اس کے کان میں پہنچا تو

ملکانی نے ''ہیلو، ہیلو'' کی رٹ بھی لگائی، نتیجے میں ادھر سے فون رکھ دیا گیا۔ اس کا ردعمل ایک خطرناک گالی کے سوا کیا ہو سکتا تھا سو اس نے گالی کے گندے لفظ فضا میں پھینک کر پھر فون اٹھایا۔ اس مرتبہ ایک بھاری آواز نے ملکانی کی باتوں کا جواب دیا کہ سیٹھ جی میں قصے کہانیاں پڑھتا ضرور ہوں اور اپنے اسکول میں یہ سب پڑھاتا بھی ہوں لیکن ناول لکھنا اور پھر اسے چھپوانا، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ پریس والے ہی آپ کا یہ پرابلم سلجھا سکتے ہیں۔ چنانچہ حکم چند ملکانی نے اب کلاسک پرنٹرز سے بات کرنے کے لیے نمبروں کو دبایا۔

ہوا یہ تھا کہ اتنے عرصے میں کلاسک پرنٹرز کو اس ناول کو کھڑے گھاٹ بیچ کر اپنے آپ کو بچا لے جانے کے تعلق سے کئی فون آ گئے تھے۔ ہوا یہ بھی تھا کہ ناول کا مسودہ ایک فون کال کے بعد ہی کوئی اس طرح پریس میں پہنچا گیا تھا کہ پریس والوں کو مسودہ پہنچانے والے سے ملنا کسی طرح ممکن ہی نہ ہو سکا تھا۔ مسودے کے ساتھ ہی چھپائی وغیرہ کا پورا بل معاملے پر بات چیت کے لیے ایک فون نمبر

کی چٹ کے ساتھ پیشگی پہنچا دیا گیا تھا۔ ملکانی کا دوبارہ فون آنے پر پریس مینیجر نے چٹ پر لکھا نمبر ملایا۔ دور سنچار کی جوابی کمپیوٹر فیڈ تنگ نے کہا کہ ڈائل کیے گئے نمبر کا فون عارضی طور پر بند ہے۔ مینیجر نے چہرے پر پریشانی کے آثار کے ساتھ فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ مینجر کا چہرہ کچھ اور کھنچ گیا۔ یہ فون پریس کے مالک کا تھا کہ ناول کا پرابلم نپٹ گیا ہے۔ اب اس تعلق سے کوئی بات کرے تو اسے پستک اٹھا لے جانے کے لیے بلا لینا۔

اس بار بھی رکھتے ہی فون بجنے لگا۔ ادھر ملکانی تھا۔ مینجر نے مالک کے حکم کے مطابق اسے پستک اٹھا لیجانے کے لیے بلایا۔ اس طرح راج ولاس راج کا ناول مارواڑی چال کے ایک کباڑیے کی گاڑیوں میں بھر بھر کر ماہم جھوپڑپٹی کی گندی، تنگ، اونچی نیچی گلیوں سے پچھواڑے کی کھاڑی تک پہنچا دیا گیا اور وہاں سے ایک لانچ میں رکھ کر ناول کی جلدیں کالے گندے بدبودار سمندر میں پھینک دی گئیں مگر قصہ ختم نہ ہوا۔

اس کی ایک جلد کلاسک پرنٹرز سے باہر آ کر پہلے ہی پریس کے سیاسی شعور رکھنے والے ایک ملازم کے ذریعے (اور یہ ملازم ستا دھاری پکش کا ایک معمولی رکن بھی تھا) ممبئی پارٹی آفس تک، وہاں سے پارٹی سکریٹری اور پارٹی لیڈر تک اور ان مہاشیوں کے پاس سے ہائی کمان اور اسمبلی اور پارلیمنٹ کے سرکاری منچ تک ترقی کرتی پہنچ چکی تھی۔

اور اب جب کہ عوام نے اس ناول کو لے کر مختلف سیاسی پارٹیوں کے جھگڑوں کو نیشنل چینل پر دیکھ لیا تھا اس لیے وہ سب جن کے نام ممبران پارلیمنٹ کی چیخ پکار میں سنے گئے تھے، اپنے بچاو کے لیے ملک کے طول و عرض میں کھٹا کھٹ فون کرنے لگے۔ ممبئی میں شہری وکاس منتری شری وامن راو گھورپڑے عرف اپا نے اپنے انتخابی حلقے میں شیوسینا کے شاکھا پرمکھ کے علاوہ ممبئی کر آندولن کے سکریٹری اور پارٹی، سینا اور آندولن تینوں کو سرمایہ مہیا کرنے والے سیٹھوں کو فون کر کے اپنے گاؤں جوگ واڑی کے بنگلے پر جمع ہونے کا آدیش دیا۔

اتر پردیش کے گنگا پور سے پارلیمنٹ کا ممبر بن جانے والے سادھو رام داس لاہری نے گنگا پور کے سرپنچ اور اس کے دوستوں کو گاؤں کے ہنومان مندر سے سارے ترشول اور بلم بھالے ہٹا لینے کا آدیش فون پر جاری کیا اور دہلی کے چاندنی چوک کو لال قلعے سے ملانے والی سڑک پر واقع ایک مندر

کے ٹرسٹیوں کو کچھ ایسی ہی چیزیں ادھر ادھر کردینے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے بنگلے کے احاطے میں دھونی رمائے بیٹھے سادھوؤں کے ایک ٹولے کو اپنے اپنے گاؤں چلے جانے کا حکم دیا پھر آپ ایک ایئر کنڈیشنڈ کار سے اپنے سیکریٹری اور کچھ سادھویوں کے ساتھ نیپال کی سرحد پر واقع ایک نامعلوم بستی کی طرف نکل گیا۔

سندری راجما لنکپا دکشن بھارت میں کہیں راج ماتا تھی اور مہاراشٹر کے ایک پہاڑی جنگلی دیہات تلجا نگر میں واقع سوامی پرمانند کرپالو جی مہاراج کے آشرم کی بھکتی ماتا بھی۔ دہلی کے کرناٹک بھون سے اس کے آدیش وندھیا چل اور پشچمی گھاٹ کے دور دراز جنگلوں میں پنکھ لگا کر پہنچے اور آشرموں، مٹھوں اور گئوشالاؤں کے تہہ خانوں میں ذخیرہ کی گئی آتش بازیوں پر پانی ڈال دیا گیا۔ ستر سالہ سوامی جی اس سمے اپنے آشرم کے دودھ سے بھرے ایک سوئمنگ پول میں درجن بھر اپسراؤں کے ساتھ لیلا مگن تھے کہ قریب کنارے پر رکھی ایک تپائی سے خصوصی فون کا بزر بجنے لگا۔

گجرات کے راج سنگھاسن پر براجمان تلک دھاریوں نے کسی فون وون کی پروانہ کی بلکہ امداواد کے گیتا مندر سے گاندھی نگر کے اکشر دھام تک انہوں نے گئو ماتاؤں کی ایک ریلی نکال ڈالی اور میاں لوک اور میاں دھرم کے خلاف زہریلے آتشیں نعرے لگاتے ہوئے (سرکاری صحافتی زبان میں) ایک فرقے کے دھرم ستھانوں کے آگے دیر تک گاتے بجاتے ناچتے اور گلال اڑاتے رہے۔ اسی دن دہلی میں کسی نیتا کی سمادھی پر سرودھرم پرارتھنا کا آیوجن بھی کیا گیا۔

اسی دن مغربی سرحد پر خاردار تاروں کی باڑھ پھلانگ کر بہت سے بھیڑیے راجستھان کے بے آب و گیاہ صحرا میں گھس آئے اور قریبی دیہاتوں کو اپنا مسکن بنالیا۔ اسی دن کشمیر کے اننت ناگ ضلع کے ایک سرحدی گاؤں میں پاکستانی گھس پیٹھیوں نے ایک مندر میں گھس کر اس کے مہنت اور بھکتوں کو گولیوں سے بھون ڈالا اور اسی دن کشمیر ہی میں (اور کشمیر میں تو ایسے واقعات روز کا معمول ہیں) شری نگر کے ایک بڑے صحافی عبداللہ بٹ کے گھر اور آفس پر ملٹری نے چھاپہ مارا کہ اسے یہاں آتنک وادیوں کے موجود ہونے کا اشارہ ملا تھا۔ اسی دن ....

باب : ۲

حوالدار واکڑے نے اپنی بائیں ہتھیلی پر گاے چھاپ زردے اور چونے کا آمیزہ رکھا اور دائیں ہاتھ کی بیچ والی انگلی سے دبا کر اسے رگڑنا شروع کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے پشپا نگرکر کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک دیکھا بھی۔ پشپا کی طرف یوں دیکھتے ہوئے اس کا دھیان تمبا کو رگڑنے والی انگلی کی طرف زیادہ تھا۔

پشپا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دل ہی دل میں اس نے حوالدار کو خاصی مردانہ گالی دے ماری اور اس مار کا اثر حولدار پر واضح طور پر ہوا کہ اچانک اس نے تمبا کو رگڑنا بند کر کے آمیزے کو دوسرے ہاتھ سے تھپکی دی اور پشپا کے سینے سے نظریں ہٹا کر پوچھا، ''کیا لپھڑا کری رے آج؟''

''لپھڑا میں کاے کو کرتی سائب'' پشپا کہنے لگی، ''وہ بھڑوا چندو آج پھر میرے منہ پر باٹلی مارنے کو آیا ہوتا۔''

''چندو؟'' واکڑے نے پھر کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

''چندو دادا'' پشپا نے بتایا، ''وہ تو کسمت اچھی تھی میری، بچ گئی، نئیں تو میرے منہ کا کُسڑا بن جاتا۔''

''تو اب اِدر کیا ہے تیرا؟''

''اس کا کمپلین لکھو سائب اور ہم کو اِدر چین سے جینے دو۔''

''ارے منتری کا آدمی ہے وہ'' واکڑے نے تمبا کو نچلے ہونٹ میں دباتے ہوئے نفرت سے اس کی طرف دیکھا، ''سالی کھُد کو سمجھتی کیا ہے رے تو؟''

''سائب، اپن گریب مانس آ ہے''

''جا، لکھ لوں گا جا، اس کے لپھڑے میں نکو پڑ'' پشپا کی طرف دیکھتے ہوئے پولس والے کی آنکھیں پھر ہوسنا کی سے آگ ہونے لگی تھیں لیکن اب پشپا پر کرختگی کا خول چڑھ گیا تھا جیسا کہ جسم فروشی کے پیشے میں اکثر وہ اسی خول میں رہتی۔ وہ واکڑے کی کرسی کے پاس سرک آئی اور واکڑے دروازے کی طرف دیکھتا ہوا ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت تھانے میں دوسرے وردی پوش بھی ضرور تھے اور دونوں کی باتوں سے لطف بھی لے رہے تھے، واکڑے کے کھڑے ہو جانے سے وہ الرٹ ہو گئے۔ سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھی تھیں جہاں ان کے خوف کے سوا کوئی نہ تھا۔

''اوبائی'' کسی دوسرے وردی والے نے اپنی جگہ سے آواز دی، ''کیا لپھڑا لے کے آئی رے؟''

''ارے وئی چندو دادا کا'' واکڑے بتانے لگا۔ ''وہ اس کا گھر والا ہوتا نا''

''اوسائب'' پشپا نے اس کی بات کاٹی، ''وہ میرا گھر والا کائے کو ہوئیں گا۔ وہ حرامی پلا تو میرے کو پھر سے بیچنے کا سوچ رَیلا ہے۔''

چندو اُسے سنیما میں ہیروئن بنانے کا جھانسا دے کر ہیرا بائی اندور والی کی تماشا منڈلی سے بمبئی بھگا لایا تھا۔ یہ تماشا منڈلی اپنے ایک کھٹارا ٹرک پر ہیرا بائی کی جوانی کی بلیک اینڈ وائٹ تصویروں والے مراٹھی میں چھپے پوسٹر لگائے دکشن مہاراشٹر کے گاؤں گاؤں جا کر گیت سنگیت، ناچ گانے اور کتھا ناٹک کے پروگرام روپے دو روپے میں دکھایا کرتی تھی۔ کچھ رنگین کٹ آؤٹ بھی ٹرک کے سر پر باندھے نظر آ رہے تھے۔ جن میں ایک ڈھولکیے اور ناچتی ہوئی دو جوان لڑکیوں کو دکھایا گیا تھا۔ ڈھولکیے کے ڈھول پر اس کا نام لکھا تھا: ماسٹر ہری پرساد اور لڑکیوں کی کمر پٹن پر لکھے ان کے نام کیل سے ٹھونک دیے گئے تھے: گنگا بائی اور جمنا بائی اور یہ دونوں اس تماشا منڈلی میں کبھی نہیں رہی تھیں البتہ ان کی جگہ شانتا شرڈیکر اور دھنّو رانی نام کی دو معمولی شکل وصورت والی لیکن شوخ چنچل نوعمر لڑکیاں ضرور تماشائیوں کا دل بہلانے کے لیے موجود تھیں۔ ہری پرساد کے علاوہ ہیرا بائی کا نوعمر بھائی ناچیا بھی اس منڈلی کا خاص کردار ادا کار تھا۔ تماشا منڈلی کی ایک تکنیکی

ضرورت کے تحت جس کی مردانگی ختم کردی گئی تھی۔ شانتا اور دھنو رانی سے زیادہ خوبصورت ہونے کی وجہ سے ناچیا دیہاتی تماشائیوں میں خاصا مقبول تھا اور جب تک منڈلی کسی گاؤں میں ڈیرا ڈالے رہتی، ناچیا راتوں کو جاگتا اور دن اس کے بے خبر سوتے گزرے۔

ہیرا بائی اندر والی چالیس بیالیس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود اپنی پیشہ وارانہ شوخی، الھڑ پن اور ناٹیہ کلا کی اداؤں سے ہر وقت لیس ایک ایسی کلا کار تھی جس نے اپنی زندگی کے تیس برس عوام کی تفریح کراتے گزار دیے تھے اور اب بھی پوری توانائی سے وہ ہندوستانی لوک کلا کی سیوا میں لگی ہوئی تھی۔ جس گاؤں میں اس کی منڈلی اپنا ٹرک روک لیتی، وہاں کے سیٹھ ساہوکار، سرپنچ، ماسٹر، پوسٹ ماسٹر سبھی راتوں کو رنگین بناتے رہتے۔

شرڈی کے سائیں بابا کے درشن کو آئے ہوئے کسی خاندان کی ایک آٹھ دس برس کی لڑکی مندر کی بھیڑ سے نکلتے ہوئے ماں باپ سے بچھڑ کر روتی ہوئی کسی طرح مندر کے پیچھے پھیلے ہوئے باغاتی علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ یہیں جھاڑیوں کے پیچھے ہلکی ہو کر جب ہیرا بائی آڑ سے نکلی تو اس نے لڑکی کو حیران پریشان دیکھا۔ یہ لڑکی آگے چل کر شانتا شرڈیکر کے نام سے اس کی منڈلی کا اسٹار بن گئی۔

دھنو رانی کو یہ نام تماشائیوں نے دیا تھا۔ پتا نہیں کس زاویے سے وہ انہیں فلم اسٹار وجینتی مالا نظر آتی تھی۔ بس جہاں وہ تماشے کے منچ پر پایل چھنکاتی آئی کہ دیکھنے والے ''دھنو رانی، دھنو رانی'' چیخنے لگے۔ اس لڑکی نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ہیرا بائی کی گود ہی میں پایا جس نے اسے احمد نگر کے ایک میلے میں منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے کچھ لوگوں سے خریدا تھا۔ اس وقت وہ چار پانچ برس کی تھی اور اب برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن تھا اس کا اور اسے خبر نہیں تھی کہ وہ ہیروئن بننے کا خواب لے کر بمبئی جائے گی اور بہت روندی جانے کے بعد میونسپل کارپوریشن آف گریٹر بامبے کی کارپوریٹر بن جائے گی۔

ہری پرساد ڈھول، طبلہ اور تنتنی کے علاوہ تماشے کی ضرورت کے مطابق ہر ساز بجانے کا ماہر تھا۔ سیکڑوں پواڑے اور لاؤنیاں اسے یاد تھیں اور بھجن کیرتن میں مہاراشٹری سنتوں کے دوہوں ابھنگوں کے ساتھ ہندوستان بھر کے صوفیوں کا اردو فارسی کلام بھی وہ اپنے مخصوص مراٹھی لہجے میں گانے کے لیے مشہور تھا۔ اس کا بھی خواب تھا کہ فلمی دنیا میں جا کر میوزک ڈائریکٹر وغیرہ بن جاؤں

چنانچہ پشپا عرف دھنورانی کے بمبئی نکل بھاگنے میں اس نے بھی مدد کی تھی اور وہ اس طرح

بمبئی آگرہ روڈ پر واقع شہاپور میں بستی میں داخل ہونے والی سڑک کے مقابل اندروالی کی تماشا منڈلی نے پاس کے گاؤں کی جاترا میں خاصی کمائی کرنے کے بعد ابھی ابھی ڈیرا ڈالا تھا۔ ہری پرساد اور ناچیا کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے بستی میں پہنچے تھے۔ ان کا حلیہ ہی گاؤں میں تماشا منڈلی کے آنے کا اعلان بن جاتا تھا اس لیے راستہ چلتے لوگوں، دکانداروں اور آوارہ لڑکوں نے انہیں سودا سلف خریدتے دیکھا تو تماشے کی خبر گلی گلی پہنچ گئی۔ ناچیا کی شوخیاں لوگوں کو متوجہ کر رہی تھیں اور ہر پرساد سے اس کا لگ کر چلنا لڑکوں کو اس پر فقرے کسنے کے لیے اکسا رہا تھا اور یہ انھوں نے کیا بھی۔

''اے ہے کجری'' ایک آواز آئی۔ ناچیا نے آواز کی سمت دیکھا اور آنکھ مار دی۔

''کُٹھون آلی گ چھمک چھلو؟''

''جوڑیے، لاجونگو۔''

ان چھیڑخانیوں سے بے پروا ہری اور ناچیا راستے کے کنارے کھڑی ایک ریڑھی پر بکتی چاے پینے کے لیے رک گئے۔

''کہاں سے آئی رے یہ منڈلی؟'' چاے والے نے ان کی طرف چائے کے گلاس بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''چاندوڑ سے'' ہری نے جواب دیا، ''ادھر دیوی کی جاترا چالو تھی نا''

''اچھا، اچھا'' چاے والا بولا، ''اب ادھر کب تک جمنے کا؟''

''رہیں گے کچھ دو چار اٹھواڑے۔''

کچھ چھوکرے وہاں آ کھڑے ہوئے اور ناچیا کو دلچسپی سے دیکھنے لگے جو چاے کی چسکیاں لگاتے ہوئے بھی تھر کے جا رہا تھا۔

''اِدھر کیا ہے رے پورا نو'' ہری زور سے بولا، ''ادھر رات کو آنا منڈوے میں تماشا دیکھنے، چلو بھاگ جاؤ۔''

اِدھر تو منڈلی کے دونوں کلاکار گاؤں میں لچھن دکھاتے پھر رہے تھے اُدھر ہیرا بائی بان کی پلنگڑی پر چت لیٹی شانتا اور پشپا سے پیر دبوا رہی تھی۔ کبھی اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں بھی نکل جاتیں۔ تبھی پنچایت کا ایک آدمی ''تماشے والی، اے تماشے والی'' کی پکار لگاتا وہاں آ گیا۔

ہیرا بائی پیر دبوانے کی عیاشی چھوڑ کر بمشکل اٹھی اور چلائی، ''کون ہے رے اُدھر؟'' کہتے ہوئے اس نے گرا ہوا آنچل بلاوز کے گریبان میں اڑس لیا۔ شانتا اور پشپا نے بھی اپنے کپڑے درست کیے۔

تماشا منڈلی کا سارا ساز وسامان ٹرک سے اتار کر میدان میں ڈھیر کر دیا گیا تھا اور ہیرا بائی کی لڑکیوں کے لیے اسی وقت ایک چھولدار لگا دی گئی تھی۔

پردہ اٹھا کر وہ اندر آ گیا۔ ہیرا بائی نے اسے نظر بھر دیکھا۔

''می چندو کار بھاری'' آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔

یہ تیس بتیس سال کا لمبا تڑنگا، بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کالا بھجنگ نوجوان تھا۔ ماتھے پر تلک، گلے میں سونے چاندی کی زنجیریں اور بھگوا ریشمی کرتا پہنے اور ویسا ہی تہبند باندھے ہوئے صاف شیوسینا کا آدمی دکھائی دے رہا تھا وہ۔

ہیرا بائی کھڑی ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ ''آؤ سرکار'' اس نے پرنام کرتے ہوئے کہا، ''گریب کی سیوا''

''اِدھر منڈلی بٹھانے کا کیا؟'' چندو نے سوال کیا، ''پنچایت کی پرمِسن ہے کیا؟'' کہتے ہوئے وہ ادھر ادھر کا جائزہ بھی لئے جا رہا تھا، لڑکیوں کو گھور کر وہ مسکرایا بھی۔

''تھوڑے دن کمائی کریں گے سرکار'' ہیرا بائی نرمی سے بولی، ''آؤ، ادھر بیٹھو۔'' اس نے لوہے کی ایک کرسی آگے بڑھائی، ''گریب لوگ ہیں سرکار''

''پرمِسن تو لینا منگتا نا بائی جی'' چندو کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا، ''پنچایت کی پاوتی بھی پھاڑنا پڑے گی۔''

''وہ تو کریں گے بابو جی'' ہیرا بولی اور شانتا کی طرف مڑ کر کہنے لگی، ''چل اے پوری، جلدی سے نیتا جی کے واستے چہا آن۔''

چندو پھر لڑکیوں کو گھورنے لگا جو لٹکتی مٹکتی چائے کا انتظام کرنے دوسری طرف نکل رہی تھیں

اور یہ لٹکنا مٹکنا ان کا پیشہ وارانہ گر تھا جسے گاہکوں کے علاوہ کسی اور کے لیے وقت ضرورت وہ استعمال کرتی تھیں اور ایسا کرنے کا انہیں حکم تھا ہیرا بائی کی طرف سے۔

تبھی باہر...... ہری پرساد اور تا چیا کی آوازیں آنے لگیں۔ ان کے ساتھ لڑکیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ منڈلی کا سامان اتارنے والے دو چار لڑکوں کا شور تھا اور ٹرک ڈرائیور کی گالیوں کا طوفان سب پر بھاری۔ معلوم رہے کہ اس منڈلی میں صرف ڈیڑھ مرد اور تین عورتیں نہیں تھیں، ان کے ساتھ دوسرے کئی مرد عورتیں لڑکے لڑکیاں، گائے بیل، کتے، مرغے مرغیاں وغیرہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ یہ جہاں پہنچ جاتے، جنگل میں منگل ہو جاتا۔ ان کی چھولداریوں اور گھیرے کے آس پاس میلے بازار کی سی چہل پہل شروع ہو جاتی۔

باہر کے شور پر کان لگائے ہوئے چندو ہیرا بائی کو نہارے جا رہا تھا۔ ہرے بھرے جسم پر کس کر باندھی ہوئی مراٹھی ساڑی جس کا پلو ہیرا بائی نے اپنے گریبان میں پھنسا رکھا تھا۔ ایک سرسبز باغ کا منظر کھل گیا تھا چندو کی آنکھوں کے سامنے۔

''چہا گھیا سرکار'' چندو اس آواز پر چونک پڑا۔ پشپا چائے کا گلاس لیے اس کے پاس کھڑی تھی۔ چندو نے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ چائے خوب گرم تھی اس لیے اس کی زبان اور ہونٹ جل گئے۔

فوراً گلاس منہ سے ہٹا کر وہ سسکارا، ''آئی لا......''

''شانتی سے سرکار، دھیرج سے'' یہ ہیرا بائی تھی۔

چندو نے گلاس میں چائے کو گردش دی تا کہ وہ کچھ ٹھنڈی ہو جائے۔ اس اثنا میں وہ برابر پشپا کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بھی ہارنے والی نہ تھی۔

چائے ختم کر کے اس نے پھر ہیرا بائی کے سراپے پر نظر ڈالی اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر مار کر اٹھا۔ ''تم بائی، کیا کرنے کا؟''

''جو کرنے کا سرکار'' ہیرا بولی، ''وہ تم کو ئچ کرنے کا، ہم گریب کیا تو بھی کر سکتے ہیں۔''

''اچھا، اچھا چلنے دو'' چندو اپنی مونچھوں میں مسکرایا، ''پن پاوتی لینے کا مت بھولنا اور میرے دو چار لڑکے تماشے میں آتے رہیں گے، بھلا کیا''

''ارے جرور سرکار'' ہیرا خوش ہو گئی، ''تماشا تمارا، تماشے والے بھی تمارے۔'' وہ اِٹھلا کر

چندو کے ذرا قریب آ گئی اور ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

ہری پرساد اندر آ گیا۔

''ارے ہریا'' ہیرا بائی نے فوراً اس سے کہا، ''یہ نیتا جی کو پہچان لے، ادھر شہاپور میں ان کی سرکار چلتی ہے۔''

''اچھا، اچھا'' ہری نے ہاتھ جوڑ دیے، ''نمسکار سرکار''

چندو نے سر ہلایا اور چھولداری کے باہر نکل گیا۔

شہاپور کے بس اسٹینڈ، بازار، چوک، پنچایت اور گلی محلوں میں آگرہ روڈ پر آنے والی تماشا منڈلی کا اعلان کرنے والا تانگا گھوم گیا تھا۔ ان ساری جگہوں پر ہیرا بائی اندور والی اور گنگا جمنا کے پوسٹر لگا دیے گئے تھے۔ بستی میں آنے والی سڑک کے موڑ پر تماشے کے کٹ آؤٹ اسی طرح کھڑے کر دیے گئے تھے کہ ہیرا بائی کا ہاتھ تماشے کے تمبو کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سارا دن یہاں لڑکوں بچوں کا ہنگامہ رہنے لگا تھا اور پھیری والوں کی ریڑھیاں اور اسٹینڈ پر رکھے تھال دیر رات تک نظر آنے لگے تھے۔ شام ہوتے ہی تمبو سے فلمی گانوں کے ریکارڈ پوری آواز میں بجنے شروع ہو جاتے اور بیچ بیچ میں گانا روک کر تماشے کا اعلان کیا جاتا۔

چندو کار بھاری کے گرُگے تماشے میں ہر وقت خوش فعلیاں کرتے اور آنے جانے والوں، خاص طور پر بوڑھوں کو چھیڑتے۔ ان میں آپس میں مار پیٹ بھی ہو جاتی۔ ان سب کی نظریں تماشے کی لڑکیوں پر تھیں۔ کسی کو تمبو سے باہر دیکھ پاتے تو دیر تک اس سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتے۔ اکثر چندو بھی ان کے ساتھ نظر آتا جو ہیرا بائی سے ملنے یا پنچایت کے ٹیکس کے تعلق سے آیا ہوتا۔ بار بار کے اس آنے جانے میں پشپا اسے جچ گئی تھی کیونکہ اس نے پشپا کو اُس زاویے سے دیکھ لیا تھا جس میں وہ وجینتی مالا کی طرح نظر آتی۔

ہر رات دس بجنے کے بعد تماشے کا منچ کیروسین لیمپوں سے روشن ہوتا اور کمر میں لال ریشمی دوپٹا باندھے، کلائیوں میں گجرے لپیٹے، جھلملانے ریشمی کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں جب ناچیا وہاں ہری پرساد کے طبلے کی گمک پر ٹھمکے لگاتا تو سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تماشائی مارے خوشی

اور جوش کے اچھل اچھل جاتے۔ شانتا، پشپا اور دوسری لڑکیوں کا فلمی گیت پر شہوت انگیز ناچ اور خاص طور پر مذاحیہ ڈرامائی مناظر جن کے مکالمے فحش کلامی سے بھرے ہوتے، نہ صرف نوجوان لڑکوں بلکہ بوڑھوں کو بھی گرم کر دیتے۔

تماشے کے ابتدائی چند روز خاصے گرم رہے۔ ہیرا بائی اور اس کی لڑکیوں نے وہ رنگ جمایا کہ تماشے کے اکاؤنٹنٹ کو جو ٹرک ڈرائیور بھی تھا، روپے کا حساب رکھنا مشکل ہو گیا مگر دوسرے تیسرے ہفتے کمائی رک سی گئی پھر چندو گاؤں کے سرپنچ کا ایک بڑا پروگرام لے آیا۔

''اُدھر ریسٹ ہاؤس میں سرکاری مہمان آ رہے ہیں'' اس نے ہیرا بائی سے کہا، ''شہاپور پنچایت کے بڑے لوگ ان کے آدرستمان میں کچھ ناچ گانا رکھنے والے ہیں۔''

''نیتا جی ہم تو لوک آنند کے لیے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔'' ہیرا بائی نے کہا، ''سرکاری لوگوں کو ہمارا گانا کیا پسند آئے گا۔''

''ارے سب چلتا ہے ان کو'' چندو بے پروائی سے بولا، ''تھوڑی دیر گانا وانا سنتے ہیں پھر کھاپی کر ہوں......'' اس نے جملہ پورا کرنے کی بجائے ''ہوں'' کو کھینچا۔

''گانا کدر ہوئیں گا؟''

''اُدرِچ ریسٹ ہاؤس کے پیچھے، ایم ایل اے ساب کے بنگلے میں۔ وہ لوگ کیا تیرے تمبو میں آئیں گے؟''

معاملہ طے ہو گیا۔

ہری پرساد کو پشپا اور چندو کے معاملے کی بھی سن گن مل گئی تھی۔ اس نے چندو کو جھولداری کے پیچھے پشپا کے ساتھ زبردستی کرتے بھی دیکھا تھا اور پھر پشپا چندو کے ساتھ راجی کھشی ملنے لگی ہے، اس کی بھی ہری کو خبر تھی۔

''کیوں دھنورانی'' اس نے ایک بار پشپا کو ٹوک دیا، ''چندو سے کیا چل رہا ہے تیرا؟''

پشپا گھبرا گئی، کانپنے لگی، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''میں کچھ پوچھتا تیرے سے۔''

''وہ، وہ'' پشپا بمشکل بول سکی، ''وہ مجھے ہیروئن بنانے کو بولتا۔''

ہری زور سے ہنسا۔''بن جا، جا'' ہنستے ہوئے اس نے کہا، ''تو سنیما میں ہیروئن جرور بن، پن یہ گریب آدمی کو مت بھولنا۔''

معاملہ طے ہو گیا۔

ایم ایل اے کا بنگلا سیاسی، سرکاری وی آئی پیز کے علاوہ سماجک کاریہ کرتاؤں سے بھرا تھا۔ مرمریں فرش کے ڈرائنگ ہال میں اطالوی کھڑکیوں کے بیچ بیچ کے ایک تخت پر سردار جگموہن سنگھ کلکٹر ضلع تھانہ، ایم ایل اے شری بھیم راؤ کدم اور سرپنچ مکند یادو براجمان تھے اور تخت کے سامنے مخملی صوفوں پر شہاپور اور آس پاس کے دیہاتوں سے آئے ہوئے سماجی دھرماتما۔ سب نے سرپنچ سے تحفے میں ملی ہوئی لال پیلے چھینٹوں والی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ہال کے بیچ پڑی ہوئی گلاس ٹاپ والی بڑی سی گول میز پر شراب کی بوتلیں اور شفاف شیشے کے بہت سے گلاس چمک رہے تھے۔ میز پر منرل واٹر کی کچھ سیل بند بوتلیں بھی رکھی تھیں اور چاندی کی پلیٹوں میں پھل اور خشک میوے سجے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کا انچارج اُپ ابھی یِنتا ایس کے پاٹل مہمانوں کی ہر طرح خاطرداری کے لیے اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا اور چپراسیوں، کلرکوں اور مقامی سماجی فنکاروں کی فوج اس کے دائیں بائیں۔ ان کے ساتھ چندو کار بھاری اور اس کے جوان بھی بہت چستی دکھا رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کے کچن سے لگا ایک بڑا روم ہیرابائی کی منڈلی والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ منڈلی کے درجن بھر سے زیادہ کلاکار اور سازندے یہاں اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ تبھی چندو یہاں آ کر جھانکا۔ اس کی نظریں پشپا کو تلاش کرنے لگیں جو پردے کی آڑ میں چھوٹے کپڑوں کو ڈھانک رہی تھی۔ ناچیا گھنگھرو باندھے چھم چھم کرتا پھر رہا تھا۔ چندو نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔

''وہ کہاں ہے رے؟'' چندو نے پوچھا، ''دھنورانی؟''

ناچیا نے مسکرا کر کاجل بھری آنکھ سے پردے کے طرف اشارہ کر دیا اور ہلکے جھٹکے سے اپنی بانہہ چھڑا کر سسکاری بھری۔

''ہات ٹٹ گیا میرا'' وہ اِٹھلایا۔

چندو بھی مسکرایا اور بولا، ''جرائلا اس کو'' کہتے ہوئے اس نے گلے میں پڑی زنجیروں کو ادھر ادھر کیا، پشپا نے پردہ سرکا کر اس کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے پوچھا، ''کیا ہے؟''

چندو نے بھی اسی طرح کچھ جواب دیا۔

معاملہ طے ہوگیا۔

ہری پرساد کے علاوہ چندو کے جوانوں کو بھی اس معاملے کی خبر تھی بلکہ وہ ایک اہم کردار اس معاملے میں نبھانے والے تھے چنانچہ سنگھ صاحب جو شعروشاعری کے شوقین تھے، شراب سے پوری طرح لبریز ہوجانے کے بعد غزل سننے کی فرمائش کرنے لگے تو انجینئر پاٹل کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

''اے ہیرابائی کو بُلا، ہیرابائی کو'' سرپنچ غصے میں چیخا، ''سائب کو گجل ٹھمری کی تلپ لگی ہے۔''

''ہیرابائی کو بلاؤ۔''

''ہری پرساد...... ہری پرساد''

ایک ساتھ کئی آواز سنائی دیں اور اسی وقت سرخ مراٹھی ساڑی میں ہیرابائی زیورات سے سجی اپنے سازندوں کے ساتھ کلکٹر کے دربار میں حاضر ہوکر مجرا بجالائی۔ اس کے ساتھ آنے والی لڑکیوں اور سازندوں نے بھی جھک جھک کر سنگھ صاحب کو سلام کیا اور پھر شروع ہوا صاحب کی غزل کی طلب بجھانے کا عمل۔ ہیرابائی اور شانتا پشپا وغیرہ کے گانے صاحب بے دلی سے سنتے رہے، البتہ ناچیا کو انہوں نے پہلو میں ایسے دبا رکھا کہ اس کا ہلنا مشکل ہوگیا۔ اسی کے ہاتھ سے جام بھر بھر کے لیتے رہے۔

پھر معاملے کے مطابق پشپا نے موقع دیکھ کر ہیرابائی کے کان میں کہا، ''بائی، میری تبیت بگڑتی ہے۔''

عورتوں کا یہ کوڈ سن کر ہیرابائی تلملا گئی۔

''ارے بھوانی'' وہ غصے میں دانت پیس کر پشپا کے کان میں پھسپھسائی، ''تو سائب کو بڈھا

مل گیا گانا کون سنائے گا، تیری میّا؟''

''میں بگڑ گئی بائی، میرے سے بیٹھا نئیں جاتا'' کہہ کر پشپا یوں ادھر ادھر دیکھنے لگی گویا راہ فرار ڈھونڈ رہی ہو۔

ہری پرساد اس وقت اپنے سازوں کو ادھر ادھر کر رہا تھا۔ ہیرا نے اس سے کہا، ''ہریا، لے یہ مریلی کو تمبو میں چھوڑ کے آ۔''

تماشے کے تمبو کے پاس چھولداریوں سے ذرا ہٹ کر اندھیرے میں ایک ٹیکسی کھڑی تھی اور چندو بھی تھا وہاں۔ پشپا نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تو ڈر مت'' وہ بولا، ''ادر گاڑی میں بیٹھ جا، میں ابھی پرت آتا۔''

پشپا نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ذرا فاصلے پر ہری کو دیکھا۔ چندو اس کے پاس کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر چندو دوبارہ ٹیکسی کی طرف آیا اور اس کے قریب آتے ہی کچھ سائے آس پاس سے نمودار ہو کر ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

''بھیما؟'' چندو نے پوچھا۔

''ہا'' جواب ملا، ''می بھیما''

سائے قریب آ کر چندو کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر چندو گھبرائی ہوئی پشپا کے پاس آیا۔

''ڈرنا گھبرانا مت'' اس نے پشپا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''میں بھی ساتھ آ رہا ہوں، تیرا سامان ٹیکسی میں پیچھے رکھ دیا ہے۔'' پھر وہ لڑکوں کی طرف گھوما، ''چلو رے، سٹکو اب سھاں سے''

لڑکے فوراً ٹیکسی میں آگے پیچھے سوار ہو گئے۔ دو نے پشپا کو اپنے بیچ لے لیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ دو لڑکے اور بیٹھ گئے اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ تمبو سے ہائی وے پر آنے کا سفر تین چار منٹ میں ختم ہو گیا اور

گہری گہری سانسیں لینے والے دونوں لڑکوں کے بیچ پھنسی ہوئی پشپا مشکل ہی سے سانس لے پا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ چندو کے جھانسے میں آ کر میں کیوں

ہیرا بائی کو دھوکا دے کر بھاگ گی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے چندو پر بھروسا کیا تھا اور وہ ساتھ نہیں آیا تھا۔ راستے میں لڑکوں نے اسے دلا سا بھی دیا کہ چندو ساتھ کی دوسری گاڑی میں ہے اور جلد ہی اس سے ملے گا۔

''اے رامیا'' پشپا کی بائیں طرف والے لڑکے نے اگلی سیٹ پر کسی کو مخاطب کیا۔ ''ٹائم کا ے جھالا رے۔''

ڈرائیور کے پاس بیٹھے لڑکے نے پلٹ کر پہلے پشپا کو دیکھا پھر وقت پوچھنے والے کو جواب دیا، ''اکراوا جلے، گیارہ گیارہ''

''بھیّا'' پچھلی سیٹ سے وہ لڑکا اب ڈرائیور سے بولا، ''بھیا، جرا بور کر بھاؤ کے ڈھابے پر گاڑی روک لینا، اُدر چھا پانی کر کے نکلتے ہیں'' کہتے ہوئے وہ پشپا کی طرف یوں جھکا گویا گاڑی مڑ رہی ہو۔ پشپا بچنے لگی تو دوسرے لڑکے سے اس کا بدن پوری طرح چپک گیا۔

''جرا سنبھال کے بھیا، سنبھال کے'' پیچھے سے دوسرے لڑکے نے کہا۔

''آئی لا، روڈ بھوت چکنی ہے سالی'' ڈرائیور کی آواز۔

''تیرے پاس ٹیپ ویپ نئیں کیا رے؟'' اگلی سیٹ کے دوسرے لڑکے نے ڈرائیور سے پوچھا، ''جرا دھنورانی کو گانا وانا سنا، ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا۔''

پسینے میں تر پشپا کے دل کی دھڑکن ٹیکسی کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ کیسٹ پر بجتا ہوا گیت اس کے کانوں میں دھمک پیدا کر رہا تھا۔ اس کے بدن کے مختلف حصّوں پر سانپ رینگ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی کہ یکا یک ٹیکسی ایک جگہ اچھلی، تب کہیں اس کی آواز پھندے سے نکل کر لبوں پر آئی۔

''روکو، گاڑی روکو'' وہ چلاّ اٹھی، ''او بھیا، گاڑی روک دو۔''

''ہاہاہا'' سب لڑکے ہنسے اور ایک بولا، ''دیکھ رے دیکھ رامیا، یہ ڈرائیور کو بھیا بولتی''

''بولنے دے، بولنے دے'' ڈرائیور کی آواز، ''ادھر ڈھابے پہ چل کر اس کو راکھی باندھنے کو بولتا''

لڑکے پھر ہنسے اور پشپا سچ مچ رو پڑی۔ تبھی ٹکسی ہائی وے چھوڑ کر بائیں جانب ایک کچے ٹوٹے پھوٹے راستے پر اچھل اچھل کر اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ اس کی روشنی میں جگہ جگہ

گڑھے نظر آ رہے تھے۔

''تیرے پاس اڈھا ہے کیا رے؟''ایک لڑکا،''جلدی نکال، بھوت پیاس لگی ہے۔''

''سبر کر جرا، سبر کر''دوسرا لڑکا،''ادھر ڈھابے پر ادھا پورا سب ملیں گا۔''

زرد روشنی میں ایک نیم تاریک چھپر نظر آیا۔ ٹیکسی وہاں روک دی گئی۔ اندر بیٹھے بیٹھے ہی رامیا نے آواز لگائی، او موٹھا بھاؤ''

بڑی بڑی مونچھوں والا دھوتی اور بنیان پہنے ادھیڑ عمر کا ایک شخص چھپر کے ستونوں سے نکل کر ٹیکسی کے پاس آ گیا۔

''موٹھا بھاؤ'' وہی لڑکا بولا،''می رام راو، ادھر چھا پانی کے واستے چندو مہاراج نے بولا۔ ہے۔''

''ارے آوَ، تو رامیا نا؟'' آنے والا خوش ہو گیا۔''چندو مہاراج نئیں آیا تمہارے سنگات؟''

''آتا ہے'' رامیا نے جواب دیا،''پیچھے کی گاڑی میں آتا ہے'' کہہ کر وہ ٹیکسی سے باہر نکلا۔ اس نے پشپا سے بھی اترنے کو کہا۔

''نئیں'' وہ سہم کر سمٹ گئی،''میں اِدرِچ ٹھیک''

''ارے اُتر مہارانی'' رامیا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔''جرا باہر کی ہوا بھی کھا۔''

ٹیکسی سے اترنے والے پانچوں لڑکے پشپا کو گھیرے ہوئے قندیل کی زرد اندھی روشنی سے بھرے چھپر میں لے گئے۔ اس کے دونوں ہاتھ اب دو لڑکوں کی گرفت میں تھے اور پیچھے سے ایک نے اس کی کمر پکڑ رکھی تھی۔

اس نے بہت کوشش کی خود کو چھڑانے کی، سسکی روئی، چلائی، تڑپی لیکن جال سے نکل نہ سکی۔

''چلانے بوم مارنے کا کام نئیں کیا'' ڈرائیور بولا۔''اِدر ایسیچ شوٹنگ ہوتی۔''

ستونوں پر کھڑے چھپر کے نیچے دو چار کھاٹوں کے اطراف لوہے کی چند کرسیاں پڑی تھیں۔ انھوں نے پشپا کو ایک کھاٹ پر ڈھکیل دیا اور کرسیاں کھینچ کھینچ کر اس کے گرد یوں بیٹھ گئے گویا کھانے کی تیاری میں ہوں۔

وہ پسینے میں نہائی ہوئی، ہاتھ پاؤں سُن لیکن دل کی دھڑکن کانوں میں دھمکتی ہوئی۔ اس نے ایسی وحشت میں ایک ایک کی طرف دیکھا۔ دو لڑکوں نے اس کے ہاتھ اور دو نے پنڈلیوں کو دبا رکھا تھا۔

تبھی چھپر والا اس کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ پشپا نے آنکھیں چڑھا کر اسے الٹا دیکھا۔ اس کے حلق سے آواز نکلنے کو ہوئی مگر ڈرائیور نے اس کا منہ دبا دیا۔

''کیا کرتے رہے تم اس کا؟'' چھپر والے نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''اس کا جھٹکا کرنے کا'' رامیا بولا۔

''ابے چندو کو بھی آ جانے دیتے۔''

''موٹھا بھاؤ'' ڈرائیور بولا ''ہردم تو وچ تا جا مال کھاتا ہے، آج اس کو کھانے دو بچا کھچا۔''

''کھانے کے پہلے پینے کی بات کر رامیا''

''ہاں، ہاں موٹھا بھاؤ، جرا کڑک والی کنڑی نکالو، پھر کریں گے دھنورانی کی تکا بوٹی''

''جرا سی چکھ لوں کیا رے اِس کو'' ڈرائیور کی رال ٹپکنے لگی۔ کہتے ہوئے اس نے پشپا کے ہونٹوں کو چٹکی میں مسل دیا۔ پھر اس کا ہاتھ گردن سے نیچے کی طرف سرکنے لگا اور.........

ہُوا تو بہت کچھ لیکن جو کچھ ہوا، کھوج خبر رکھنے اور لکھنے والوں کی پہنچ سے بہت دور ہوا اور پربت دور ہو تو رائی نظر آتا ہے۔

ٹھیک اسی وقت گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں کلکٹر صاحب نے ناچیا کو کمرے میں ڈھکیل کر اپنے پیچھے روم کا دروازہ بند کیا۔ ہیرا بائی تماشے میں واپس آ کر زور زور سے پشپا کو پکارنے لگی۔ اس کی آواز سن کر ہری پرساد مسکرایا اور

صبح جب چندو کا نشہ ٹوٹا تو اسے پشپا یاد آئی۔

''آئی لا'' وہ ہڑبڑایا، ''پورگے تو اس کو کھا جائیں گے سالے'' سوچتے ہوئے اس نے بستر چھوڑنے میں دیر نہ کی اور

دو گھنٹے بعد آگرہ روڈ پر کنڈکٹر پر چیخ چلا کر اس نے ایک خاص جگہ بس رکوائی اور باہر آ کر ہائی وے لگے ایک کچے راستے پر تقریباً دوڑتا ہوا بڑھا۔

بورکر بھاؤ کا ڈھابا سنسان پڑا تھا۔ چندو ''موٹھا بھاؤ، موٹھا بھاؤ'' پکارتا ہوا چھپر تلے آیا تو بورکر ایک کھاٹ پر مدہوش پڑا تھا اور دوسری کھاٹ پر پشپا پڑی ہوئی مردہ سی نظر آ رہی تھی۔ چندو نے اس

کا شانہ ہلایا تو اس نے کراہ کر آنکھیں کھولیں۔ کچھ پل شانہ ہلانے والے کو دیکھا اور پھر درد و کرب کی شدت سے اس نے آنکھیں موندلیں۔ چندو نے اب بورکر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ چند لمحے کچھ نہ سمجھ کر گنگ بیٹھا رہا، پھر رات والے لڑکوں کو گالیاں دینے لگا۔

''تو نے بھیجا تھا سالوں کو؟'' وہ چیخا، ''تیرا نام لے کر وہ ادھر مستی نکالنے آئے تھے سالے۔''

چندو کو بورکر کی پروانہ تھی۔ وہ پھر پشپا کی طرف پلٹا جو بورکر کے چلانے سے ہوش میں آ گئی اور کسمسا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے رات کا سارا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہونے لگا اور جیسے جیسے اپنی بپتا اسے یاد آئی، درد کی ٹیسیں ناف کے مرکز سے اس کے پورے جسم میں دوڑنے لگیں۔ اس نے سسکار کر دونوں ہاتھ رانوں کے بیچ دبا لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بمبئی پہنچ کر پشپا کے لیے انجان مقام کی ایک چال میں وہ ٹھہرے۔ کھولی کا تالا چندو نے کھولا اور دروازہ اندر کی طرف ڈھکیل کر پشپا کو دیکھنے لگا۔

''آجا'' وہ بولا۔ ''اندر آجا، یہ تیرا چ گھر سمجھ۔''

پشپا ہچکچاتی ہوئی اندر آئی۔ دس فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی ایک کھولی تھی، ننگی اجڑی بجڑی دیواریں اور سر پر لکڑی کی چھت جہاں سے کچھ گرنے پڑنے کی دھمک سنائی دے رہی تھی یعنی اوپر کوئی اور بھی رہتا تھا۔

چندو نے کہا تو تھا کہ یہ تیرا چ گھر ہے لیکن وڑا پاو کھا کر اور بازو کی کھولی والے سے مانگ کر پانی پینے کے بعد پشپا وہاں صرف ایک رات بے چینی سے کاٹ سکی۔ دوسرے ہی دن صبح چندو اسے ایک اور انجان جگہ لے گیا اور یہ جگہ پہلی سے بدتر تھی: جھگی جھوپڑیوں کا جنگل، دو اور چار پیروں والے جانوروں کے ساتھ ساتھ کیڑے مکوڑے، گندگیوں اور بدبوؤں کا بھنڈار۔

ایک نیچی سی جھوپڑی میں چندو نے پشپا کو بٹھا دیا۔ یہاں دو بوڑھی عورتیں پہلے سے موجود تھیں اور جھوپڑی کے سامنے زور زور سے بولتے ہنستے چیختے آٹھ دس مردوں کا ہجوم تھا۔ پشپا سے چندو نے دو منٹ میں آنے کا کہہ کر باہر کھڑے مردوں میں کسی کو آواز دی۔

''ارے، چندو دادا'' آواز سن کر ایک مسٹنڈا خوش خوش وہاں آیا۔ چندو نے ایک طرف لے

جا کر اس سے کچھ باتیں کیں۔ آنے والا بار بار جھوپڑی کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھ لیتا اور چندو کی باتیں سن کر ہاں یا ناں میں سر ہلاتا جاتا۔ پھر اس کے سر کی حرکتوں سے معلوم ہوا کہ وہ چندو سے متفق ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے دادا، ٹن پھکر جاؤ'' وہ بولا، ''اپن سب سنبھال لیں گا۔ چھو ایک بکری ہے، تمارا بل اُدر سے چکتا کرالو۔ یہ پاکٹ'' کہتے ہوئے اس نے چندو کو ایک خاکی لفافہ دیا۔ ''اُدر دے دینا۔ سمجھ لینا، کام ہو گیا۔''

چندو نے لفافہ لے کر کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے ایک بار اس جھوپڑی کی طرف دیکھا جس میں اس نے پشپا کو چھوڑا تھا۔ پھر ایک تنگ گلی سے ہو کر وہ پشپا کی آئندہ زندگی کے بہت سے منظروں سے نکل گیا۔

جھوپڑ پٹی فٹ پاتھ، گٹر کے پائپ، ریلوے پلوں کے نیچے اور فلائی اوور کے کھمبوں سے لگ کر ٹاٹ کی آڑ میں دو پیروں والی کتیا کی طرح وہ جی رہی تھی۔ اس کے آس پاس ہر وقت خوفناک آوارہ سڑے ہوئے بھونکتے بھبھوڑتے کتے نظر آتے۔ ہیرا بائی کی منڈلی کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرنا، ناچ گانا، کھانا پینا، ہنسی مذاق، شاباشا تا چیا ہریا، واہ وا، ہو ہو ہاہا کی آوازیں سب اس کے ذہن سے مٹ گئی تھیں اور اب جو کچھ تھا راجی کُھشی خود کو اپنے بلاتکار کے لئے تیار رکھنا تھا تا کہ دو وقت پیٹ میں روٹی ڈالی جا سکے۔

اپنی عمر سے بڑی پشپا تماشے والی، لوہے کے ایک زنگ خوردہ پلنگ سے بھرے ڈربے میں بند ہو چکی تھی۔ انسانی گوشت کھانے والے پانچ دس روپے میں وہ سب کر جاتے جو کبھی چندو کے چھوکروں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ ڈربے اور پلنگ کا کرایہ، کپڑے، میک اپ، دوائیں کھانا پینا اور سب سے بڑھ کر دلالی اور لال بتی ایریا میں دھندا کرنے کا ٹیکس جو پولس والے، ایریا کے گنڈے اور کھدر دھاری سماج سیوک وصول کرتے۔ اور ایک دن انھیں سماج سیوکوں کے ساتھ اسے وہ نظر آیا: چندو کا ر بھاری، ویسا ہی کالا بھجنگ بلکہ تگڑا ہو جانے سے کچھ زیادہ ہی خوفناک لگ رہا تھا وہ اور اس کا بایاں ہاتھ کہنی سے کٹا ہوا تھا۔

پشپا نے سوچا کہ کترا جائے لیکن چندو لپک کر قریب آ گیا۔

''نجر چرا کے جا رئیلی تھی؟'' وہ بولا۔ اس نے پشپا کا بازو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیا، ''دیکھ، یہ دیکھ'' کہتے ہوئے اس نے اپنا کٹا ہوا ہاتھ پشپا کو دیکھایا، ''دیکھ، یہ ہاتھ تیرے کارن کٹانا پڑا۔ تیرے واستے پانچ سال اندر رہ کے آیا میں اور تو نجر چرا کے جاتی بے وپھا۔''

چندو کے ساتھ آئے دوسرے سماج سیوک اس کی تقریر سننے لگے۔ پشپا پسینے پسینے ہوگئی۔ اس کے دل میں ایک ہوک اٹھی کچھ یاد کر کے۔

''مجھے ادر بیچ کے تو کیوں بھاگا تھا، بے سرم؟'' پشپا نے چیخ کر پوچھا، ''اب بولتا کیا میرے واستے اندر گیا تھا۔''

''دیکھ دھنورانی'' چندو بولا ''تجھے وسواس نئیں آتا تو اِن سے پوچھ، میں ایک دم سچ بولتا۔''

لیکن وہ ایک دم جھوٹ بول رہا تھا۔ ہاتھ اس کا کٹا تھا اپنی پارٹی کے مخالف گروپ سے لڑتے ہوئے اور جیل وہ گیا تھا اپنے گرگے رامیا کو تلوار مار دینے کے جرم میں اور جھگڑا پشپا کے لیے نہیں بلکہ گنپتی کی چندا وصولی میں روپے کے ہیر پھیر پر ہوا تھا۔ مگر چندو کو تو ابھی پشپا کی ہمدردی چاہیے تھی اگرچہ وہ اس علاقے میں سُر کشا ٹیکس وصول کرنے آیا تھا۔

''اُدھر میرے ساتھ چل، میں تجھے لے جاتا اپنی کھولی میں، بن پھکر چل اور رانی بن کے رہ۔''

''تو کیا رانی بنائیں گا مجھے'' پشپا چڑ کر بولی، ''اِدر روج دس آتے مجھے رانی بنانے والے، چل پھٹ!''

چندو نے پھر زور سے اس کا ہاتھ پکڑا اسے اپنے قریب کھینچ کر گویا اس نے پشپا کا جائزہ لیا کہ تماشے میں ناچنے والی دبلی پتلی چھوکری اب زمانے کی ہوا کھا کر سینگ مارنے والی آوارہ گائے ہوگئی تھی۔

''چل ادھر'' وہ دانتوں کے بیچ سے بولا، ''میرے ساتھ چل، تیرا بھاو بڑھ جائے گا، دھنورانی''

''تو تو مجھے ہیروئن بنانے والا تھا''

''بن تو گئی سالی، کیا ہیروئن کا بلاتکار نہیں ہوتا، کیا وہ اپنا سر ینئیں بیچتی، کیا وہ......'' کہتے ہوئے وہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو ہلائے جا رہا تھا۔

''یہ، یہ ذُرد سا ہوئی میری'' اس نے پھر ہاتھ دکھایا، ''دیکھ تجھے ہیروئن بنانے میں یہ ذُرد سا ہوگئی میری۔''

جھوٹ نے پشپا کی ہمدردی جیت لی۔ اگرچہ ایک ہی سین میں یہ سب کچھ نہیں ہوا لیکن ڈربے سے وہ چندو کی کھولی میں آ گئی اور اب پانچ دس روپے سے بڑھ کر اس کا بھاو پچیس پچاس روپے ہو گیا۔

اس کو رانی بنانے والوں میں ذرا اونچی سوسائٹی کے لوگ شامل ہو گئے تھے اور جیسا کہ ماحول مچھلی کو اتھلے گہرے پانی میں تیرنا سکھا دیتا ہے، پشپا جس اونچی سیڑھی سے چڑھ کر نئے ماحول میں آئی تھی، یہاں کی فضا سے خود کو مطابق کرنے میں اس نے کچھ زیادہ وقت نہ لیا، یہاں تک کہ چندو کو اس کی ترقی کھٹکنے لگی اور اس نے ایک بار یوں ہی اسے لنگڑی لولی کرنے کی کوشش کر ڈالی جسے اتفاق یا حادثے کا نام دے دیا گیا۔

اس حادثے سے پشپا کو مل مزدور سبھا کے ایک سرگرم ورکر لال کشن (یعنی ایل کے) ساونت نے بچایا اور کچھ زیادہ ہی وہ اس کے پاس آنے لگا۔ نتیجے میں چندو نے اپنے ایک گرگے سے پشپا پر تیزاب تک پھنکوا دیا لیکن اس بار قسمت نے اسے بچا لیا۔ ساونت کی شے پر پشپا نے چندو کی شکایت علاقے کے پولس تھانے میں درج کرا دی۔

''اس کا کمپلین لکھو سائب اور ہم کو ادر چین سے جینے دو۔''

کمپلین لکھا کر وہ واپس چندو ہی کی کھولی میں آ ئی اور چین سے سو گئی کیونکہ اسے معلوم تھا، چندو اب کچھ دن غائب رہے گا۔ سو وہ غائب رہا لیکن ساونت پشپا سے ملنے برابر آتا رہا۔

''ایک مہیلا وکاس گٹ بنایا ہے ہماری یونین نے'' ساونت نے پشپا کو بتایا، ''اُدھر سماج کی پچھڑی ہوئی بھیک مانگنے اور دھندا کرنے والی عورتوں کو سماج میں اونچا ستھان دینے کے لیے روج کے اچھے کام دھندے سکھاتے ہیں اور کام سکھانے کے ساتھ پیسا بھی دیتے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے ساری کاغذی کارروائی پشپا نگر کر عرف دھنو رانی کے سامنے پھیلا دی۔

اب کی بار سیڑھی چڑھنے پر اسے ہری کنار والی سفید ساڑی پہننی پڑی اور کندھے پر سماجی

خدمتگاروں کا تھیلا ڈال کر ساونت اور دوسرے مردوں عورتوں کے ساتھ جلسے جلوس، میٹنگوں اور ہڑتالوں پر جانا پڑا۔

تماشا جاری تھا۔

ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک منچ سے دوسرے منچ، ایک گلی سے دوسری گلی، ڈربے سے کھولی تک، کھولی سے مزدور یونین کے اسٹاف کوارٹرز تک اور وہاں سے ہر اُس جگہ جہاں اس کی ضرورت ہوتی۔ تماشے کے مناظر، واقعات اور کردار سب بدلتے رہے۔ وہ خود بھی طرح طرح کے سوانگ لیتی رہی، لے رہی ہے۔ تماشا جاری ہے کیونکہ ابھی کھاڑی میں پھینک دیے گئے ناول کا ایک کردار ادا کرنے کی ذمہ داری اس پر آنے والی ہے۔

باب : ۳

راجدھانی میں رِنگ روڈ پر واقع ہوٹل بلومون کے لاونج میں بچھے ہوئے مخملی صوفوں کو پار کر کے وہ اپنا بریف کیس اٹھائے ریسپشن کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود کمپیوٹر کے بٹن دباتے ایک سکھ نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کاؤنٹر ٹاپ کو کھٹکھٹایا۔ نوجوان نے کی بورڈ سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میں روی مہتا...... مجھے مسٹر فرینک اوہارا سے ملنا ہے۔''

''ایک منٹ'' کہہ کر سکھ نوجوان نے فون اٹھایا اور کوئی نمبر ملا کر کہنے لگا۔ ''ریسپشن کاؤنٹر سر، ایک صاحب روی مہتا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ سامنے کھڑے ملاقاتی سے بولا، ''آپ ان سے ٹیرس پر مل سکتے ہیں سر''

''تھینکیو'' کہہ کر مہتا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

لفٹ نے اسے ٹیرس پر چھوڑا جہاں قدم رکھتے ہی اس کے سامنے سورگ کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ مختلف شکلوں کے گملوں میں جاپانی پودوں، بیلوں اور درختوں پر بہار آئی ہوئی تھی، جگہ جگہ رنگین چھتریاں نصب تھیں جن کے سایوں میں بکنی سوٹوں میں ملبوس لڑکیاں، عورتیں، جوان اور بوڑھے مرد شراب یا کولڈ ڈرنکس کی چسکیاں لیتے نظر آئے۔ نیلے ٹائیلوں والے سوئمنگ پول کے چمکتے پانی میں اس نے فرینک اوہارا کو بھی دیکھا جو آٹھ دس جل پریوں کے بیچ چہلیں کر رہا اور کنارے آ کر جام پر جام چڑھائے جا رہا تھا۔

اس لمبے چوڑے امریکی سے مہتا سنگا پور میں کچھ دنوں پہلے مل چکا تھا اور اب راجدھانی میں دونوں کی یہ پہلے سے طے شدہ ملاقات ہونے جا رہی تھی۔ مہتا نے اوہارا کو متوجہ کر کے ہاتھ اٹھایا۔ اوہارا کے چہرے پر ایک تاثر ضرور پیدا ہوا لیکن اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے ایک چھتری کی طرف اشارہ کر کے مہتا کو ادھر ٹھہرنے کے لیے کہا۔ دھوپ پڑنے سے پانی اور شیشہ اور جل پریوں کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے کالے چشمے چمک چمک جاتے تھے۔

پول کنارے لگی ایک بڑی رنگین چھتری کے نیچے ایک فولڈنگ چیئر پر مہتا نیم دراز ہو گیا۔ ساتھ لایا ہوا بریف کیس اس نے سامنے پڑی شیشے کی میز پر رکھ دیا اور سوئمنگ پول میں ہونے والا تماشا دیکھنے لگا۔

تماشے میں اس کی محویت کو اچانک فون کال نے توڑ دیا۔ ہڑبڑا کر وہ کرسی پر سیدھا ہوا اور جیب میں بجنے والا فون نکال کر کال ریسیو کرنے لگا۔

''ہاں، مہتا بول رہا ہوں'' وہ کہنے لگا، ''مالا میرے سامنے ہے، بس نپٹنے کی دیر ہے'' کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا پھر بولا، ''کچھ وکھت لگے گا، ایسے کام دھیرج سے ہوتے ہیں...... اب مجھے کال مت کرنا...... بالکل نہیں...... میں کھد تم سے بات کروں گا...... او کے'' فون بند کر کے پول کی طرف دیکھنے لگا۔

اوہارا سیڑھی چڑھ کر باہر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو جل پریاں تیر رہی تھیں۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دونوں کے منہ چومے۔ وہ پانی سے باہر آیا اور پریاں گہرائیں میں لوٹ گئیں۔

''ہیلو'' مہتا نے کھڑے ہو کر اوہارا سے ہاتھ ملایا، ''دن بہت اچھا ہے!''

''ہاں، بہت اچھا'' اوہارا نے جواب دیا، ''یہاں کا موسم آج کل اچھا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے گاؤن پہنا اور دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ مہتا نے میز پر رکھے بریف کیس پر دایاں ہاتھ رکھا۔

''چیزوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے'' اوہارا نے برف کیس کے پاس رکھی شراب کی بوتل اٹھا کر وہیں پڑے شیشوں کو بھرنا شروع کیا۔

''ضرورت بھی زیادہ ہے'' مہتا مسکرایا، ''کیا آج سپلائی ممکن ہے؟''

''کیوں نہیں'' اوہارا نے ایک جام مہتا کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے لبوں سے لگا لیا۔

''ٹرانسفر ہو گیا ہے ان چیزوں کا، اب رقم بھی ٹرانسفر ہو جانی چاہیے۔''

اب کی بار مہتا نے شراب کی چسکی لے کر ''کیوں نہیں'' کہا۔

''یہ کام بینک لنک پر ابھی ہو جائے گا۔''

''تو آؤ'' اوہارا نے جام خالی کرتے ہوئے کہا، ''کمرے میں چل کر لنک کرتے ہیں۔''

مہتا نے بریف کیس اٹھالیا اور اوہارا کے پیچھے چل پڑا۔ لفٹ ان کو ٹیرس سے نیچے ساتویں منزل پر لائی جہاں ایک سوٹ میں اوہارا کا قیام تھا۔

نیم تاریک گلیارے میں بچھے غالیچے پر بے آواز چلتے ہوئے وہ 527 نمبر کے سامنے رک گئے۔ اوہارا نے دروازہ کھولا اور داخل ہوتے ہوئے مہتا سے اندر آنے کو کہا۔ دروازہ ان کی پشت پر بند ہو گیا۔

اندر آ کر اوہارا نے جہازی پلنگ کے نیچے سے ایک بڑا سفری سوٹ کیس برآمد کیا۔ ایک میز پر رکھ کر اس نے مختلف طریقوں سے اس کے تالے کھولے۔ اندر سیکنڈوں میں دنیا بھر کے کمپیوٹروں سے رابطہ کر لینے والا سسٹم موجود تھا جس پر اوہارا اور مہتا ''چیزوں'' اور رقم کا لین دین کرنے والے تھے۔

اس سودے میں اسرائیل سے وہ تکنیکیں خریدی گئیں، ملک میں منودھرم کا پرچار کرنے والی جماعتوں کی تربیت میں جن سے فائدہ اٹھایا جانے والا تھا۔

اس سودے میں کشمیر میں دہشت گردی کے دیووں کو گھر گھر پہنچانے کے منتروں کو کمپیوٹری وسائل کی صورتوں میں بدل کر انٹرنیٹ پر ہر وقت حاصل ہونے کی سہولت بیچی گئی۔ اس سودے میں ملک کی شمال مشرقی ریاستوں میں آتنک واد اور الگاؤ واد کے پرچار کے لیے وہ فارمولے سپلائی کیے گئے جو مذہب، زبان اور رنگ و نسل کی تفریق سے قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے تھے۔

اس سودے میں بھوٹان اور نیپال میں الگاؤ وادی اشتراکی لٹریچر اور دہشت گردی کے امریکی طریقے پھیلانے کا مسالا فراہم کیا گیا۔

اس سودے میں بنگلہ دیش میں بے روزگاروں کو مزید سست اور کاہل اور بیکار کرنے کے لیے ایسے سیاسی سماجی اور تہذیبی سمجھاوے مہیا کیے گئے جو عوام میں ملک و ملت سے لاتعلقی کو ابھارنے والے تھے۔

اس سودے میں پاکستان کے فوجی اڈوں اور اداروں کو دنیا بھر کی دہشت گرد تنظیموں کے

لیے بین الاقوامی تربیت گاہوں کی طرح استعمال کرنے کی تکنیکیں جاری کی گئیں۔

اس سودے میں افغانستان، عراق، ایران، ترکی، یمن، عرب، مصر، سوڈان، شام، الجیریا، ازبکستان، قزاقستان، جرجستان، آذربائیجان وغیرہ ملکوں میں امریکی تہذیب و ثقافت کو رواج دینے کے لیے امریکی یورپی مصنوعات، فنون وادب، تعلیم و تدریس، طور طریق اور فسق و فجور کو ویب سائٹس میں بدل کر مفت دواؤں کی طرح تقسیم کرنے کے طریقوں پر بے شمار پروگرام سستے داموں فروخت کر دیے گئے۔

اس سودے میں صرف اوبارا اور مہتا نے معاملات طے نہیں کیے بلکہ دنیا بھر میں ایسے دو چار، دس بیس، سو دو سو، ہزار دو ہزار افراد نے آپس میں رابطہ کر کے چیزوں اور رقموں کا تبادلہ کیا۔

مہتا کے بریف کیس میں جو بلینک سی ڈیز اور چپس وغیرہ تھیں، اب ان کے الیکٹرونک خلیات میں ایسے بھیانک راکشس جیوت ہو اُٹھے تھے جو قوم واد، دھرم واد اور فاشزم کے انگارے اگلنے اور کاغذی سیکولرزم، دھرم نرپیکشتا اور سرو دھرم سمبھاو کے اصولوں کو جلا کر خاک کرنے کے لیے تیار تھے۔

مہتا نے چاندنی چوک کے گجراتی لاج میں واپس آ کر اپنا بریف کیس تو پلنگ کے نیچے کھسکایا اور کپڑے اتار کر میز پر ڈال دیے۔ اس نے بنیان اور نیلے پٹوں والا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اب ہلکا پھلکا ہو کر وہ پلنگ پر چت لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے پتا نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک ٹرنک فون کیا، ''ہوں دلّی تھی بولوں چھوں'' اس نے کہا، ''دھیرج سے ہونے والا کام میں نے پتا لیا ہے۔''

''جے شری رام''

''جے شری رام''

نعروں سے نوین بھائی کے بنگلے کا تہ خانہ گونج اٹھا۔ دلّی سے ایک خوش خبری آئی تھی جس نے شاہی باغ کی وی آئی پی سوسائٹی کے تمام لوگوں کو سوسائٹی کے آفس میں جمع کر دیا تھا۔

سب جوان بوڑھے مرد اور بہت سی عورتیں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں بٹے آنے والی خبر کی تصدیق یا توثیق میں مصروف تھے کہ آفس انچارج نے آ کر انہیں نوین بھائی کے بنگلے پر پہنچنے کی ہدایت کی۔ سوسائٹی کے قوم وادی سدسیوں کی میٹنگ کے لیے اسی بنگلے کا تہ خانہ متعین تھا۔

گھنٹے دو گھنٹے میں امداوادآفس کے سب سدسیہ گلے میں بڑے بڑے منکوں کی مالائیں ڈالے ہوئے، بے ترتیب ڈاڑھیوں والے تلک دھاری کاروں، اسکوٹروں اور رکشوں پر یہاں پہنچ گئے تھے۔ سوسائٹی کے احاطے میں خاصا ہجوم تھا لیکن چند خاص افراد ہی کو تہ خانے میں آنے دیا گیا۔ باقی باہر بے چینی سے کسی بات یا خبر کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً چالیس منٹ کے انتظار کے بعد ''جے شری رام'' کے نعرے نے اس بے چینی کو توڑا۔ وہاں موجود لوگ مضطرب یا گدگد ہوا ٹھے، ان کی بے چینی پھر بڑھ گئی اندر کی کسی بات یا خبر کو سننے کے لیے۔ تبھی بھگوا کرتے اور تہمد میں نوین بنگلے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ مالائیں اس کے گلے میں اور ماتھے پر سرخ سیاہ تلک

''رام کا نام بھجو'' اس کی آواز پھنسی ہوئی تھی، ''رام جی کے نام میں بڑی شکتی ہے۔ اس دیش کے کن کن میں رام جی کا واس ہے، اس دیش کا چپہ چپہ رام جی کا مندر ہے۔'' ایک لحظے کے لیے وہ رکا۔ وہاں موجود لوگ اب بھی بات یا خبر کی آشا لیے ہوئے تھے جس پر اندر تہ خانے میں نعرے لگائے گئے تھے۔

لوگ نوین کے اس انداز سے خوب واقف تھے کہ وہ پہلے شری رام کے سمرن کرتا پھر اصل بات کی طرف ذرا دیر سے آتا ہے۔ سو وہ اتسکتا سے اس کی بات سنتے رہے۔ دس منٹ کے بھجن کے بعد اس نے ''پرساد گھر گھر پہنچ جائے گا۔'' کہہ کر بات ختم کر دی۔ لوگ فوراً ادھر ادھر یا اپنے بنگلوں فلیٹوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

تین دن بعد فون پر یہ پرساد دیا گیا کہ گجرات کی جنتا ابھی کچھ دنوں پہلے بھوکمپ کی آپتی سے پیڑت ہو چکی ہے اس لیے رام جی کا نام جپتے رہو۔ ان کے نام میں بڑی شکتی ہے جو دن پرتی دن آنے والے جھٹکوں کو روکتی رہتی ہے۔

جھٹکا سخت تھا کہ دتی میں درگا مندر کے ویا پار سنکل پر چھاپہ مارا گیا ہے اور اس ابھیان میں بہت سے سادھو پکڑے گئے ہیں۔ وی آئی پی سوسائٹی کے ذمہ دار بزرگوں نے ٹی وی اور اخباروں وغیرہ سے کچھ پتا لگا لیا تھا کہ سرکار مخالف پارٹی نے کچھ ایسا کام کیا ہے جو ستادھاری پکش کی پوزیشن

کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ دلی سے واپسی پر روی مہتا یہ خبر بھی لایا تھا کہ سرکار پر سے اعتماد ختم کرنے کے لیے ایک زہریلا پمفلٹ لوگوں میں بانٹا جا رہا ہے جس کے ہزاروں ہزار نسخے پارلیمنٹ میں بھی اڑائے گئے۔ (یہ کسی اپنیاس پر پارلیمنٹ میں ہوئی لے دے کا مبالغہ آمیز گجراتی تصور تھا) مگر لوگ اسے سنجیدگی سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے کہ قصے کہانیوں جیسی چیزیں بھی سرکار کے اعتماد کو یعنی سرکار بنانے والی اکثریتی پارٹی کے سنگھٹن کو ٹھیس پہنچا سکتی ہیں۔

مہتا نے ابھی ابھی نوین کو اپنے لمبے سفر کی رپورٹ دی تھی اور اس سے جلد ہی ملنے کا وعدہ کر کے فون رکھا تھا۔ وہ اپنے کچھ ملاقاتیوں کی طرف متوجہ ہوا لیکن فون کی گھنٹی نے اسے کچھ کہنے نہ دیا۔ سامنے بیٹھنے والوں کو ''ایک منٹ'' کا اشارہ کر کے اس نے فون اٹھایا۔

''ہاں، بولوں چھوں'' اس نے کہا، پھر دوسری طرف کی آواز پہچان کر ایکدم چاق و چوبند ہو گیا، ''نمسکار سر، ہوں مہتا...... سچیو ساب کھبر تو ساچی چھے۔ ہاں جی، ہاں جی...... سارؤ...... آج سانجھے؟ ہاں جی، جرور...... چوکس، راکھوں چھوں، نمسکار، جے شری رام''

بات کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ فون رکھ کر اس نے میز سے نیپکن اٹھایا اور پسینہ صاف کرنے لگا، پھر اپنے ملاقاتیوں کی طرف پلٹا۔

''پنڈیا ساب ہتا'' اس نے مسکرا کر انھیں بتایا۔ سننے والے متاثر ہوئے کہ یہ شخص پنڈیا گجرات سچیوالیہ میں محصول کھاتے کا سیکریٹری تھا اور مہتا کے ملاقاتی اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی منی نگر شاکھا میں بھی وہ اونچا استھان رکھتا تھا۔ پھر مہتا انہیں سنگاپور اور دلی میں اپنے کارناموں کا سچا جھوٹا احوال سنانے لگا۔

اپنے انھیں کارناموں کی رپورٹ دینے کے لیے اسے آج شام امداواد گاندھی نگر روڈ پر واقع ایک چھوٹے دیہات امباواڑی کے آدھیاتمک سادھنا کیندر میں پنڈیا نے ملنے کے لیے کہا تھا اس لیے کچھ کاغذات، سی ڈیز اور اپنے اخراجات کے بہت سے جھوٹے سچے بل لے کر وہ امباواڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاندھی نگر کی طرف مڑنے سے پہلے مہتا نے آشرم روڈ کے کئی سرکاری غیر سرکاری آفسوں اور مندروں میں رک کر اپنے بعض دوستوں اور ضروری لوگوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ شام کے

چھ بجتے بجتے اس کی کار گاندھی نگر روڈ پر دوڑ رہی تھی۔

''گاندھی نگر دس کلومیٹر'' کا جہاں سنگ میل گڑا ہے وہیں سے امباواڑی کی طرف راستہ مڑ جاتا ہے۔ اس زراعتی علاقے میں زمینداروں کے مزدوروں کی آبادی ہے اور کھیتوں سے ذرا فاصلے پر ایک پرفضا گھنے باغ میں رام اوتار عرف پانڈے جی باپو کا آدھیاتمک سادھنا کیندر۔

دیپ چند پنڈیا کیندر کے آفس میں مہتا کا انتظار کر رہا تھا۔ جب مہتا کی کار احاطے میں داخل ہوئی تو ہی اس کی انتظار کی کوفت ختم ہو سکی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آ گیا اگر چہ گورنمنٹ کا سیکریٹری ہونے کے ناطے اسے مہتا کے لیے اتنی بے چینی کا اظہار نہ کرنا چاہیے تھا لیکن یہ معاملہ کچھ دھرم کرم کا سا تھا اور پنڈیا کو اپنے علاقے کا اہم دھارمک آدمی ہونے کی وجہ سے اس میں گہری دلچسپی دکھانی بھی ضروری تھی۔ پھر آج مہتا کی بھی اپنی اہمیت تھی۔

دونوں نے ہاتھ ملائے۔ مہتا نے ساتھ لایا ہوا بریف کیس سامنے میز پر رکھا اور گجراتی رسم کے مطابق خیر خیریت پوچھنے کے بعد وہ آفس کی خاص کرسی چھوڑ کر آمنے سامنے کرسیاں رکھ کر بیٹھ گئے۔

''شوں لیشے؟'' پنڈیا نے پوچھا، ''ٹھنڈو کہ گرم!''

''کچھ بھی چلے گا'' مہتا نے کہا، ''کیا کچھ اور لوگ آنے والے ہیں؟''

''رمیش اور اونکار کو بلایا ہے'' پنڈیا نے جواب دیا، ''اب تک تو ان کو آ جانا چاہیے تھا۔''

تبھی کیندر کے احاطے میں کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔

''لگتا ہے وہ لوگ آ گئے۔''

باہر سے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آئیں اور آگے پیچھے چلتے ہوئے، جن کا انتظار تھا، اندر آ گئے۔ ایک بار پھر خیر خیریت پوچھی گئی اور ایک جیسے جوابات دہرائے گئے۔ ایک بار پھر ہاتھ ملانے کی رسم پوری کی گئی اور آنے والوں میں سے ایک بولا، ''کسی کو بھیج کے کار میں سے سوٹ کیس منگا لے یار، کل ممبئی سے ایک گاڑی آیا تو کچھ بوتلیں بھی آ گئی ہیں۔''

''واہ یار، کیا دھماکا کیا!'' پنڈیا رانوں پر ہاتھ مار کر بولا ''میں کسی کو امداواد بھیجنے والا تھا اس کے لیے۔ تم تو جانتے ہو، اے لوکو یہ سب پھڑوا ساتھ لے کے نئیں چل سکتا ناں۔''

''سرکاری نوکر سالے اتنی مجبوری کیسے دکھاتے رے'' سوٹ کیس کی بات کرنے والا پھر بولا ''ابے تمے لوکو سالا سرکارنا جمائی راج''

سب ہنسنے لگے، پنڈیا نے بیل بجا کر کسی کو بلایا۔ آنے والا ایک دبلا دیہاتی نوکر تھا جسے بلوکار سے سوٹ کیس نکال لانے کا حکم دیا گیا۔

''ہاں بھئی'' اب وہ مہتا کی طرف متوجہ ہوا، ''اب اپنا بریف کھولو اور شروتھی جاؤ، اگر سی ڈی پلییر کی جرورپڑے تو وہ بھی بتادو۔''

''بی پی دیکھنا ہے تو منگالو۔''

''دیکھنا بھی ہے اور کھیلنا بھی ہے۔''

''اور وہ سنگاپور والا مال؟''

''اس کے لیے تو کمپیوٹر منگتا اور وہ تم نوین بھائی کے بنگلے پر دیکھ سکتے ہو۔'' مہتا نے کہا اور بریف کیس کھولنے لگا۔

اتنی دیر میں نوکر باہر کی بلوکار سے ایک سوٹ کیس نکال لایا تھا۔ رمیش نے اسے کھولا اور شراب کی بوتلیں نکال کر میز پر سجادیں۔

''جرا سا کی کا پربندھ بھی ہو جائے'' اس نے بوتلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''تھئی جشے تھئی جشے'' پنڈیا مسکرا کر کہا، ''وہ بھی ہو جائے گا۔'' پھر وہ نوکر کی طرف مڑا، ''اے کرن، وہ سامنے کا مکان دیکھ''

سامنے کا مکان کیندر کے آگے پھیلے ہوئے میدان کے پرے ایک لہلہاتے کھیت کی باڑھ سے لگا تھا۔

''تاں تھی گھیلیا کی باڑی کو ادھر لے کے آ۔''

نوکر نے دور مکان کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر آفس کے باہر نکل گیا۔

''گھلیا کی باڑی؟'' مہتا نے سوالیہ نظروں سے پنڈیا کی طرف دیکھا، ''کون ہے یہ؟''

''گھیلیا کی باڑی، گھیلیا کی باڑی ہے، بیجو کون؟'' پنڈیا نے ہنس کر جواب دیا۔ ''ادھر آپھس سمھالتی ہے'' اس نے وضاحت کی، ''ساپھ سپھائی، کاگج پتر وگیرے۔''

اور وہ سب بے چینی سے گھیلیا کی بیوی کا انتظار کرنے لگے۔

منو دھرم اور قوم واد کو دنیا بھر میں رائج کرنے کا خواب دیکھنے والی پارٹیوں کے کرتا دھرتاؤں نے جب مہتا کا لایا ہوا مال دیکھا تو انہیں چپے چپے پر رام مندر کے درشن ہو گئے لیکن دلی سے آئی ہوئی ایک خبر اور بہت سی فون کالوں نے انہیں بھوکمپ سے پیڑت گجرات کے نونرمان کی طرف دھیان بنائے رکھنے پر یا کم سے کم ایسا ظاہر کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے باوجود یہ پارٹیاں کچھ کر گزرنے کے لئے پر تولتی رہیں۔ نتیجے میں گئو ماتا ریلی کا آیوجن کیا گیا۔ گیتا مندر سے جمالپور ہوکر آسٹوڈیا روڈ طے کرتا ہوا ہزاروں گایوں کا یہ ریوڑ پانچ کنواں سے گاندھی روڈ پر مانک چوک، جامع مسجد، تین دروازہ، الف کی مسجد اور بھدر کالی مندر کا چکر کاٹ کر ریلیف روڈ سے کالو پور ہوکر واپس گیتا مندر جانے والا تھا۔

اس بڑی ریلی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی گئو ماتا ریلیاں امداواد کے دوسرے علاقوں سے بھی نکلنے والی تھیں اور ان کے لیے ایسے راستے چنے گئے تھے جن پر جگہ جگہ اقلیتی فرقے کی عبادت گاہیں پڑتی ہوں یعنی میاں لوک کی آبادیوں سے گزر کر ان ماتاؤں کو سابرمتی میں اشنان کرانا تھا۔

سو یہ سب ہوا اور پولس اور فوج کی نگرانی میں ہوا۔ تمام سنگھٹنوں کے نیتا، سادھو سنت اور مہنت پجاری ان ریلیوں میں آگے آگے رہے۔ اونچی سوسائٹی کی عورتوں نے فلمی گیتوں کی دھنوں پر گربا کھیلا اور باجوں گاجوں کا اتنا شور ہوا کہ اس دن امداواد کی کپڑا ملوں کے سائرن سنائی نہ دیے۔

اس تماشے کا نام انہوں نے شانتی یاترا رکھا کہ گئو ماتا شانتی کا پرتیک ہے۔ اس یاترا میں لیکن جن اقلیتی علاقوں سے یہ حیوانات گزرے ان کا مقصد میاں لوک کو اتیجت کرنا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے نہ صرف عبادت گاہوں کے سامنے ناچ گانا کیا بلکہ اسلام دشمن نعرے بھی لگائے اور پڑوسی ملک کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ بے زبان گئو ماتاؤں کو راستوں پر ادھر ادھر ہنکاتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض جگہوں پر گائیں سرپٹ دوڑیں اور انہوں نے غریب سادھوؤں اور ابلا ناریوں کو روند ڈالا۔ اس لیے کچھ شرپسندوں نے مسلم محلوں میں پتھراو کر کے اس بکی کو مٹایا۔ اس شانتی یاترا میں سیکڑوں انسان اور حیوان زخمی ہو گئے اور بہت سوں نے جانیں گنوا دیں۔ کئی دنوں تک راجیہ بھر کے شہروں اور دیہاتوں پر خوف و ہراس کے بادل چھائے رہے، چھائے رہنے دیے گئے (یہ ریلیاں امداواد کے

ساتھ بھاونگر، وڑودرا، بھروچ، سورت وغیرہ اور مہاراشٹر کے نواپور اور نندوربار تک نکالی گئی تھیں)

اسی موسم میں روی مہتا اور دیپ چند پنڈیا کو گاندھی نگر میں بھاجپا بائی کمان کے حضور پیشی دینی پڑی۔ منووادی جماعتوں کے سربراہوں کے علاوہ اس دربار میں راجیہ سرکار کے منتری، سچیو اور کلرکوں سے لے کر پٹاوالا ؤ تک نے حاضری دی۔

عام سبھا کے بعد مکھیہ سچیو کے بنگلے پر دربار خاص تک مہتا اور پنڈیا کو جانا پڑا۔ جہاں ممبئی میں چھاپے اور بانٹے گئے یا بانٹے جانے کے لیے تیار کسی پمفلٹ یا پستکا میں کچھ گجراتی سیٹھوں کے مشرقی ملکوں سے دہشت گردی کی تکنیکی معلومات اسمگل کرنے کا تذکرہ کیا گیا تھا۔

''تنے کھبر چھے ای وات نی'' مکھیہ سچیو نے مہتا کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا، ''تو کیٹلا لوکو تھی تیاں ملاکات لیدھی؟''

''گھڑاں لوکو تھی'' مہتا نے ہڑبڑا کر جواب دیا، ''سنگاپوری، امریکی، یوروپی، چینی، جاپانی'' وہ سب قوموں کے نام گنانے لگا۔

''اِدھر کا...... ادھر کا کون مانس ملا تھا وہاں تیرے کو؟'' یہ سوال آدھیاتمک کیندر کے مہنت نے کیا۔

''یاد نئیں'' مہتا بولا ''یاد نئیں مِنے۔''

''یاد رکھنا پڑتا ہے'' مہنت پھر بولا: ''اتنے گپت معاملے میں سب لوگوں کا نام، سب لوگوں کا چہرہ یاد رکھنا پڑتا ہے۔''

''دیپ چند بھئی'' نوین نے پنڈیا کو مخاطب کیا، ''ادھر سب سچے ہندوؤں کا جماوڑا ہے۔ سب سچے رام بھکت ہیں اور سچے ہی من سے اس دیش میں رام راجیہ لانے کے پریاسی ہیں۔ اس لیے سڑک سے لے کر سرکار تک......'' جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اپنی تقریر کے آخر میں کہتا اس لیے مکھیہ سچیو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''شری نوین بھائی'' وہ بولا ''یہ بھی سچے رام پریمی ہیں، کنتو اب ان کا اگلا کدم کیا ہوگا، یہ ان پر سپشٹ کرو۔''

''اگلا کدم'' نوین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا،'' اگلا کدم اب ہم گودھرا سے اٹھائیں گے۔''

''یہ میاں لوک'' وہ کہتا رہا،''پورے سنسار میں بہت چلبلا رہے ہیں سالے۔ ۱۱رستمبر کو انہوں نے امریکہ میں کیا کیا، یہ پورے وشو کو مالوم ہے۔اب ان کی کمر توڑیں گے ہم اور اس کے لیے تمھارے سنگاپور کے کاریہ کرم سے بڑا کاریہ کرم ادھر امداواد میں ہم نے تیار کیا ہے۔''

''ہم کو......'' مکھیہ سچیو نے ایک ایک کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا،''ہم کو کایدا کانون کی پروانہیں، ہم کھد کایدا بنانے والے ہیں اور سب کو اپنے کانون کے انڈر میں لانے کا ہمارا اُدیشیہ ہے، اس کی پریکٹس ہم ادھر گودھرا میں کریں گے......''

وہ بولتا رہا اور سب سنتے اور سر دھنتے رہے۔ پورے منصوبے کا بیان ختم کرنے کے بعد اس نے آخر میں کسی قدر بلند آواز میں نعرہ لگایا،'' جے شری رام'' وہاں موجود رام راجیہ کے سبھی اُپاسکوں نے بھی جی کھول کر جواب دیا،'' جے شری رام''

''رام سے لو لگائیں گے''

''مندر وہیں بنائیں گے''

''ایودھیا بھومی کس کی ہے؟''

گجرات میں ستا جس کی ہے!''

''جے شری رام...... جے شری رام''

ہر شخص ایک خاص جذباتی پریم ترنگ اور بھکتی رنگ میں ڈوب گیا۔

رام نام ست ہے!

اس دربار سے نکل کر مہتا اور پنڈیا دونوں ہی کار میں امداواد کی طرف روانہ ہوگئے۔ گاندھی نگر سے دس کلومیٹر باہر آنے پر مہتا نے پنڈیا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،''چل یار، جرا امباواڑی چلتے ہیں۔''

''کیوں بیٹا، کھیلیا کی باڑی یاد آئی کیا؟'' پنڈیا نے ہنستے ہوئے پوچھا اور کار امباواڑی کی طرف موڑ دی۔

باب : ۴

پارک اسٹریٹ (کولکاتا) کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل ایسٹ اینڈ میں ملک بھر سے آئے ہوئے یا بلائے گئے قصے کہانیاں لکھنے والے ان فنکاروں کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ان میں بہت سے فنکار دہلی، لکھنو، جے پور، ممبئی اور بنگلور وغیرہ مقامات پر لیے گئے فکشن سیمناروں میں ایک دوسرے سے مل چکے تھے لیکن یہاں کولکاتا میں کسی سیمناری موضوع کے بغیر ایک خاص فکشن ورک شاپ کے لیے ان کا اجتماع ہورہا تھا۔ ہوٹل کا ایک خاص ونگ ان کے لیے مخصوص تھا اس لیے دو دنوں سے آنے والے فنکار یہاں خوبصورت لاؤنج میں ایک دوسرے سے مصافحے اور معانقے کر رہے تھے۔ بعض تو غیر ضروری محبتوں کے اظہار سے خود کو تماشا بنائے ہوئے تھے اور بعض ضروری محبت کے اظہار سے بھی کترا رہے تھے۔ ''اخاہ، اوہو، ہائے، شریمان، جناب، محترمہ، شریمتی جی'' وغیرہ وغیرہ بے معنی بے مقصد الفاظ ہوا میں اُچھالے جارہے تھے اور بے شمار جذبات، بے شمار باتیں، بے شمار مسئلے، بے شمار الفاظ، سگریٹیں، شرابیں، کتابیں، میزوں پر گلاس، کپ، پلیٹیں اور ان میں پورے ادھورے غذائی لوازم، یادیں، وعدے، شکایتیں، محبتیں، نفرتیں اور ان سب کے بیچ آتی جاتی خوشبوئیں، لہراتے رنگ، لچکتے بدن، ہنسی قہقہے وغیرہ وغیرہ بے معنی مقصد۔

میرا یادو اور شری کانت دوبے میں ادب، سیاست، مذہب اور سماجی اقدار وغیرہ پر زوردار بحث چل رہی تھی جو سیکس پولیٹکس، مذہب میں عورت کے درجے اور سماج میں اس

کے مقام جیسے نکات سے گزر کر ہوٹل کے لاؤنج اور ڈائننگ ہال سے ہوتی ہوئی ایک رات میرا ایا دوا اور دوسری رات دوبے کے روم تک پہنچ گئی۔ تیسرا دن بھی چونکہ مہمان فنکاروں کی آمد کا تھا۔ اس لیے یہ دن انھوں نے کولکاتا کے مشہور مقامات کی سیر میں گزارا اور رات اپنی جاے قیام سے الگ ہوٹل میں بسر کی۔

''سب بیکار کی باتیں ہیں'' دوبے نے خود کو پلنگ پر گراتے ہوئے کہا، ''یہ راج کارن، دھرم، سماج اور سماجی رشتے سب بکواس ہیں سالے اور اصل چیز ہے......'' کہتے ہوئے اس نے میرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، ''اصل چیز ہے فزیکل گریٹ فکیشن''

''لیکن ہمیں یہاں جس ورکشاپ میں کرم کرنا ہے، وہ راج کارن، دھرم اور سماج آدی باتوں سے گہرا سمبندھ رکھتا ہے۔''

''شریمتی جی'' دوبے نے اس پر چھاتے ہوئے کہا، ''اس ہوٹل میں ہم جس کرم کے لیے آئے ہیں وہ سب کرموں سے بڑھ کر ہے۔''

''میری فزیکل تھیوری مجھے روکتی ہے کہ کوئی مجھے اس طرح استعمال کرے۔''

میرا نے اپنے پر چھائے ہوئے دوبے کو پرے ہٹانے کی یوں ہی سی کوشش کی، ''اس سمبندھ میں میری تھیوری یہ ہے کہ میں بھی اپنے پارٹنر کو استعمال کروں، کیا کہتے ہو، اس بارے میں؟'' وہ ہنسی۔

''یہ تم عورتوں نے اچھا گھڑاک پھیلا رکھا ہے کہ آدمی تمھیں استعمال کرتا ہے'' دوبے بولا۔

''ارے صاحب، آدمی تو سالا مراجاتا ہے کہ کوئی حسینہ اسے اپنے گلے کا ہار بنائے پھرا کرے۔''

''دیکھو شری کانتن'' میرا بولی، ''میں کوئی حسینہ وسینہ نہیں ہوں، اپنی آیو کی آدھی شتابدی ختم کر رہی ہوں اور اس وردھاوستھا میں چاہتی ہوں کہ تم سے اپنی سیوا کراؤں''

''ہاہاہا'' دوبے رانوں پر ہاتھ، مار کے ہنسا، ''تم مجھ سے دو تین سال سینئر ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہو، ضرور اٹھاؤ لیکن اس کے لیے کسی فیمی نسٹ تھیوری کو بیچ میں کیوں لاتی ہو، لو، ایک اُپیوگی وستو کی طرح میں حاضر ہوں تمھارے لیے۔''

میرا نے مسکرا کر اپنے بال کھول دیے اور چت لیٹے ہوئے دوبے پر اپنا کسی قدر بھاری

جسم رکھتے ہوئے اس کے کان میں پھکاری، ''تم تو وِواہت ہونا، دوبے؟''

''یس، آئی کنفیس'' دوبے کی آواز بھی پھنسی ہوئی تھی، ''ایک بیوی اور تین بچے ہیں میری فیملی میں۔''

''تو آپ ایک سیکنڈ ہینڈ آبجکٹ ہیں مسٹر دوبے'' کہہ کر میرا نے اس کا کان دانتوں میں دبالیا اور دونوں آبجکٹیو سطح پر ہر رشتے سے بے نیاز ہو کر سانپ لیٹی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

پروفیسر جگموہن ورما نے اس کے نام اپنے کسی خط میں یا فون پر اس سے بات کرتے ہوئے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں پینسٹھ سالہ ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے ورما نے اسے فون کر دیا تھا کہ میں ایک خاص فنکشن میں کلکتہ آرہا ہوں، اب ملاقات پر تمھاری تھیسیس پر باتیں کریں گے۔ سو وہ یعنی میناکشی مکرجی ورما کے کلکتہ پہنچنے کے ٹھیک وقت پر ایسٹ اینڈ پہنچ گئی تھی اور ورما ابھی ابھی نام رجسٹر میں لکھوا کر اپنے سوٹ میں پہنچا ہی تھا۔ میناکشی کاؤنٹر سے سوٹ نمبر معلوم کر کے ادیبوں کے لیے مخصوص ونگ کی طرف دھڑکتے ہوئے دل سے دوڑ گئی۔ نیم تاریک گلیارے میں وہ دائیں بائیں نمبروں کو پڑھتی بالآخر سرے کے بند دروازے پر پہنچی، دم درست کیا، چہرے پر آئی ہوئی لٹوں کو کانوں کے پیچھے سرکایا، ایک دو لمبی سانسیں لیں اور کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

کچھ لمحوں بعد دروازے کی اندرونی کڑی سرکانے کا کھٹکا ہوا۔ میناکشی کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہو گئے تھے کہ دروازہ کھلا اور اندر اُسے ایک بوڑھا نظر آیا، سفید بالوں سے بھرا سر، آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک، گورے بھرے ہوئے چہرے پر کئی موٹی جھریاں، بدن پر سفید پاجامہ اور قمیص جس کا گریبان کھلا ہوا۔

''پروفیسر جگموہن ورما سر؟'' میناکشی نے دھیمی آواز میں کسی قدر گھبرائے ہوئے پوچھا، ''میں میناکشی مکرجی......''

''اوہو، میڈم مکرجی'' دروازے پر کھڑے بوڑھے نے یکلخت اس کا ہاتھ پکڑ لیا، ''جی ہاں، اندر آیئے میں وہی ہوں جس نے پرسوں رات آپ کے شہر میں آنے کا آپ سے وعدہ

کیا تھا۔''

میناکشی کا ہاتھ سرد پڑ گیا، پیر کانپنے لگے، گلے میں پھندا سا محسوس ہوا۔ ورما اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے اسے کمرے میں بچھے صوفے تک لایا۔

''تو آپ ہیں وہ میڈم مکرجی'' اس نے میناکشی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، ''تشریف رکھیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ میرے ساتھ ہی ہوٹل پہنچی ہیں۔''

''جی، جی ہاں'' وہ کہنے لگی، ''آپ نے یہاں پہنچنے کا وقت بتا دیا تھا اس لیے آسانی ہوگئی، پھر میں یہیں پاس ہی رہتی ہوں، سر''

''اچھا، اچھا'' ورما بولا، ''ہم نے بیس سال سے کلکتہ چھوڑ رکھا ہے اور وہاں بامبے میں رہنے پر مجبور ہیں۔''

''آپ تو وہیں یونی ورسٹی میں ہیں نا، سر؟''

''یونی ورسٹی میں تھا۔ اب تو ریٹائرڈ ہوئے پانچ سال ہو گئے لیکن فیملی کے پڑھنے اور نوکری کرنے والے بچوں کے کچھ پرابلمز ہوتے ہیں نا، اس لیے ادھر ہی بس گیا ہوں۔ ویسے یہاں کی یاد ستاتی رہتی ہے۔'' وہ مسکرایا، ''آپنی کیمون آچھین؟ کیسی ہیں آپ؟''

''آمی بھالو آچھی سر۔ آپ بتائیے، آپ کا سفر کیسا رہا؟''

''سفر کا کیا ہے؟'' ورما نے کہا، ''اب تو ہم پلین سے چلتے ہیں۔ ایک زمانے میں بامبے سے یہاں پہنچنے میں تیس چالیس گھنٹے بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ سمے لگتا تھا۔'' کہتے ہوئے اس نے میز سے پانی کا گلاس اٹھا کر میناکشی کی طرف بڑھایا جسے ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ اس نے لے لیا۔

''تھینکیو سر'' کہتے ہوئے میناکشی نے گلاس منہ سے لگایا۔ ایک گھونٹ لے کر بولی، ''آپ سے ملاقات ہوگئی، یہ میرے لیے بڑے سوبھاگیہ کی بات ہے، سر۔ آپ میرے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ بھی میرا سوبھاگیہ ہے۔'' ورما ممبئی میں بیٹھ کر میناکشی کی بنگلا تھیسس پر کچھ مدد کر رہا تھا۔ اس تعلق سے ایک زمانے سے ان کی خط و کتابت تھی اور فون پر بھی اکثر مشورے چلتے تھے۔ اب میناکشی یہ موقع بھلا کیسے گنوا دیتی کہ پروفیسر جگموہن ورما، درجنوں کتابوں کے لیکھک اور ساہتیہ اکادمی کے انعام یافتہ ادیب اس کے شہر میں آئیں اور وہ دوڑ کر ان سے

ملاقات نہ کرے۔

''اور کون کون آرہا ہے، سر، اس فنکشن میں؟'' میناکشی نے رسماً پوچھا۔

''بہت سے لوگ ہیں'' ورما نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا، ''ساہتیہ اور آرٹ کے بڑے بڑے مہارتھی پدھار رہے ہیں یہاں، بلکہ کئی ایک تو آچکے ہیں۔''

''سر، مجھے ان سب سے ملائیں گے آپ؟''

''ضرور'' ورما ہنسا، ''کیوں نہیں، یہیں میرے ساتھ رہو اور سب سے ملاقات کرلو۔''

''اور سر، میں نے کچھ لکھا ہے، آپ اسے بھی دیکھ لیں تو......''

''ہاں بھئی کیوں نہیں'' ورما خوشدلی سے بولا، ''وہ تو ہماری ڈیوٹی ہے ایک طرح سے'' کہتے ہوئے وہ میناکشی کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے لڑکی کا پوری طرح جائزہ لے لیا۔ چہرہ، سینہ ہاتھ پیر، قدوقامت، بدن پر جوانی کی پھبن۔

ورما کو بدن پر آگے پیچھے گوشت رکھنے والی عورتیں پسند تھیں اور میناکشی اسے ایسی ہی نظر آئی۔

''راج نیتی والے ٹھس لوگوں میں بیٹھ کر ساہتیہ کی چرچا کرنے سے تو اس لڑکی سے اس کی تھیسیس پر بات کرنے میں مزا آئے گا'' ورما نے سوچا۔

راج نیتی والوں سے ساہتیہ کی چرچا کرنے سے پہلے ہونے کو تو بہت کچھ ہوا ہوٹل ایسٹ اینڈ کے خاص ونگ میں، جیسے میرا یادو اور دوبے کی فیمنزم پر بحث، میناکشی مکھرجی کی تھیسس کے کچھ حصوں پر پروفیسر ورما کے لمبے لمبے مشورے اور مشوروں کی فیس وصولی، پرگتی وادی شام سندر اگروال اور اتراد ھنکتا کے پرچارک ڈاکٹر راجندر ناتھ جھا کے نئے مارکسزم پر گرما گرم مباحثے کے بعد آپسی گالی گلوج اور ہاتھا پائی، جیا سرکار، میرا یادو، اوما چوہان اور کلکتہ کی سوتنتر مہیلا سماج کی نیتا مالتی پٹنایک اور اس کے ساتھ آئی دوسری بہت سی مہیلاؤں کا ڈائننگ ہال سے، مرد ادیبوں کے، خاص طور پر شری کانت دوبے کے، عورتوں کی جسمانی بناوٹ کا مذاق اڑانے پر احتجاج اور واک آؤٹ اور سیاست یا سیاستدانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے یا خود کو بیچ دینے کے سوال پر کئی گھنٹوں چلی تو تو میں میں۔

بہرحال جس مقصد سے یہ فنکشن ہونے جا رہا تھا، اس کے انعقاد کے دن ملک بھر سے آئے ہوئے یا بلائے گئے یہ فنکار جب ہوٹل کے کانفرنس ہال میں جمع ہوئے تو بھلے ہی ایک دن پہلے انھوں نے سیاست اور سماج اور فلسفہ اور مذہب اور تہذیب وغیرہ کی زیرلب یا بآواز بلند ایسی تیسی کی ہو، سفید پوشوں کے سامنے ان آتش زبانوں کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔

یہ سفید پوش (ایک زمانے کی) ملکی حکومت میں وپکش میں بیٹھنے والے اراکین کی پارٹیوں کے صدر، سکریٹری، خزانچی اور فوجدار حوالدار قسم کے لوگ تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ساہتیہ اور کلا کے رسیا، قدردان اور انھیں بڑھاوا دے کر ملک کی تہذیب و ثقافت کے آثار کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرنے والے ہیں۔

انھوں نے ایک مختصر سا جلسہ تو ضرور کانفرنس ہال میں لیا پھر ایک ایک سفید پوش ایک ایک ادیب یا ادیبہ سے تنہائی میں ملا اور وپکش کی روشن خیالی، ترقی پسندی اور عوامی فلاح کے جذبے کا زوردار پرچار کرنے اور ادیبوں پر اپنا اعتماد مضبوط بنانے کے بعد ہر کہانی کار کے بیگ میں کاغذات کا طومار ٹھونس دیا گیا اور اس طومار میں کہانی کے موضوع کے ساتھ بہت سے کورے کاغذی پیڈ، ریڈیو اور ٹی وی کے کانٹریکٹ، یورپ امریکہ کے ہوائی ٹکٹ، انٹرنیشنل سیمناروں کے دعوت نامے، بہت سے کراسڈ اور بیئرر چیک اور بڑے نوٹوں کی گڈیاں شامل تھیں۔

بیگ اٹھائے سب فنکاروں کو احساس تھا کہ ہم بک گئے ہیں لیکن یہ احساس بالکل نہ تھا کہ ہم کیوں بک گئے؟

سودے کے تین دن پہلے سے ہوٹل ایسٹ اینڈ میں ادب اور آرٹ پر لے دے مچی ہوئی تھی، تین دن بعد بھی ایسے ہی مناظر وہاں دکھائی دیتے رہے یعنی میرا یادو اور دوبے، پروفیسر ورما اور ریسرچ اسکالر میناکشی، جیا سرکار اور اوما چوہان، اگروال اور جھا، وغیرہ اور وغیرہ بے شمار مسائل پر بے شمار الفاظ خرچ کرتے رہے کیونکہ فوجدار اور حولدار قسم کے ادب نوازان کے بیچ سے غائب ہو چکے تھے اور ملک بھر سے آئے ہوئے یا بلائے گئے یہ فنکار اب پھر سے ادب میں سیاست اور سیاست دان کے دخل کے خلاف بولنے کے لیے آزاد تھے۔

ہر ادیب کے بیگ میں کاغذات کے طومار کے ساتھ اس کے لکھنے کا موضوع بھی اخبار کی خبروں کی صورت میں اخبار ہی سے کاٹ کر نتھی کر دیا گیا تھا، جیسے ڈاکٹر جھا نے جب اپنے طومار سے نتھی کیا ہوا کاغذ نکال کر پڑھا تو اس پر گنگا پور کے ہنومان مندر میں دھونی رمانے والے ایک سادھو رام داس لاہری کے پارلیمنٹ کا الیکشن بھاری اکثریت سے جیت لینے کی خبر موٹے موٹے لفظوں میں چھپی ہوئی تھی کہ جوئے کی چال نے کیسے ایک گمنام ترین شخص کو یکلخت بام عروج پر پہنچا دیا۔

ڈاکٹر جھا سادھوؤں کے گڑھ بنارس کا رہنے والا تھا اس لیے اپنے اور آس پاس کے دیہاتوں کے مندروں میں ڈیرا جمانے والے سادھوؤں کی نقل و حرکت پر اس نے سماجیاتی مواد جمع کرنا شروع کر دیا اور کچھ دنوں میں اعداد و شمار، عمل و ردعمل، اسباب و علل اور سیاسی، مذہبی، سماجی اور شخصی تضاد اور توافق وغیرہ کی جو مابعد جدید فہرستیں اس نے تیار کیں، ان کے آدھار پر صحافتی متن سے سماجیاتی متن تشکیل کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہ رہا۔

جے پور اور یونی ورسٹی کی اوما چوہان کے بیگ سے میلوں ٹھیلوں میں ناچنے والی ایک لوک کلاکار موہنی ہرداس سے ثقافتی معاملات کے ریاستی وزیر راجا دیو رائے سنگھ کے ناجائز تعلقات کی خبر برآمد ہوئی کہ راجدھانی میں کلچرل ہفتہ منانے کے لیے ملک بھر سے جو لوک کلاکار آئے ان میں دھامن گاؤں کی تیس سالہ موہنی ہرداس سب کلاکاروں سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ اس پر انعامات کی اتنی بارش ہوئی کہ اپنے گاؤں، اپنے راجیہ کے دو تین مہانگروں اور ملک کی راجدھانی کے کئی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹ کھولنے پڑے۔ سرکاری افسروں اور وزیروں نے اس کے اعزاز میں تقریبات رکھیں اور بالآخر راجا دیو رائے سنگھ نے اسے پیرس میں اپنی کلا کا پردرشن کرنے پر راضی کر لیا۔

موہنی کا ٹروپ پہلے بھی یورپ کے کئی مقامات پر ہندوستانی نرتیہ کلا کے نمونے پیش کر چکا تھا۔ اب پیرس میں اس کا آگمن ہوا۔ منتری جی تو اس ٹروپ میں نہیں جا سکتے تھے لیکن ایک سرکاری دورے کے بہانے وہ اتفاق سے موہنی کے آرٹ اکادمی (پیرس) میں کلا پردرشن کے

وقت موجود پائے گئے۔ پھر فنکشن کے بعد اسے منتری جی کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر جاتے دیکھا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد پیرس کے اخباروں میں موہنی اور انڈین راجا کی اشلیل تصویریں شائع ہوئیں، نتیجے میں غیر ملک سے ملک تک اخلاقیات پر واویلا مچ گیا۔

موہنی ہرداس اس واقعے کے بعد چونکہ گمنام سی ہوگئی تھی اس لیے اوما چوہان کو اس تک پہنچنے میں کچھ تکلیف ضرور ہوئی لیکن اوما نے ذاتی طور پر اس سے ملاقات کر کے حالات کی اصلیت دریافت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی پھر اس کے قلم نے تخیل کے وہ گل کھلائے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کیا گل کھلائے کیونکہ یہ سارے گل بعض وجوہات کی بنا پر عرب ساگر کی ایک بدبودار کھاڑی میں پھینک دیے گئے۔

شری کانت دوبے کو سخت حیرت ہوئی کہ اس کے بیگ میں بہت سے دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھے ایک لفافے سے تیسرے درجے کے ایک کہانی کار ستنام کی لکھی ہوئی کہانی ''تخت اور تختہ'' برآمد ہوئی اس اصرار کے ساتھ کہ کہانی کے کرداروں کے نام بدل کر اسی کہانی کو موجودہ سیاسی صورت حال پر لاگو کر کے اس کا دوسرا متن تیار کیا جائے۔

یہ کہانی دوبے کسی رسالے میں دیکھ چکا تھا اور کہانی کار کا نام دیکھ کر ہی اس نے کہانی پڑھنے کی زحمت نہ کی تھی لیکن اب حالات بدلے ہوئے تھے اور سر پر کوئی ڈنڈا لیے کھڑا تھا اس کہانی کو نہ صرف بغور پڑھوانے کے لیے بلکہ اسی کے خطوط پر اس سے کچھ بہتر لکھوانے کے لیے بھی سو دوبے نے جی کڑا کر کے کہانی ''تخت اور تختہ'' پڑھی کہ

کہانی کا خلاصہ: ڈاکو، قاتل اور دوسرے بڑے بڑے مجرم ملکی سیاست میں داخل ہوگئے ہیں۔ اپنے انتخابی حلقوں میں ذاتی فوجیں بنا کر وہ غریب امیر عوام پر طرح طرح کے ظلم ڈھا رہے ہیں اور ملک کا روایتی قانون ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ دوبے کے ذہن میں اپنے ہی گھر کی حالت کا نقشہ کھنچ آیا۔ حوالے، گھوٹالے، بھرشٹاچار، قانون شکنی اور اپنے اقتدار کے زور میں کمزوروں پر اتیاچار وغیرہ روز کا معمول بن گئے ہیں۔ کسی کی شنوائی نہیں کہ سچ سن کر اپنا جھوٹ کھل جانے کا سبھی کو خدشہ ہے۔

''یہ راج کارن، دھرم، سماج اور سماجی رشتے سب بکواس ہیں سالے'' اس نے سوچا، ''اصل چیز ہے روپیا اور یہ کہیں سے بھی آئے، خود کو بیچ کر ہی کیوں نہ آئے۔ اسی کی طاقت ڈاکوؤں اور مجرموں کو ملک کا اقتدار دلاتی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کہانی کی زیراکس کاپی جھلا کر میز پر پٹک دی۔

دھام پور میں ایک دیہاتی گرجا کی ننوں کے بلاتکار اور فادر ایلیا براؤن کو اس کے افرادِ خاندان کے ساتھ زندہ جلا دینے کی دہشت ناک خبر کمیونسٹ ادیب شیام سندر اگروال کے حصے میں آئی۔

''یہ دھارمک پاگل پن ہے'' اس نے سوچا، ''ملک میں اقلیتی مذہب کے ماننے والوں پر اکثریتی مذہب کے ماننے والوں کا یہ ظلم ضرور ہے لیکن مذہب'' اس کی روسی فکر عود کر آئی، ''اقلیت کا ہو کہ اکثریت کا، پاگل پن ہی کی طرف لے جاتا ہے سماج کو۔ ارے، یہ اقلیت اور اکثریت بھی بکواس ہے۔ اگر سماج انسانوں کا ہے تو انھیں کم اور زیادہ میں بانٹنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اس طرح بانٹتا کون ہے؟ مذہب، زبان، ان کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، ان کی تہذیب اور ان ٹیبوز کے ساتھ انسان کا بانٹا جانا سماج کو ایکتا، سمانتا میں آنے نہیں دیتا اور یہ بات کرتے ہیں یک جہتی کی، ایکا تمتا کی۔''

خبر کا کاغذ ایک طرف ڈال کر اس نے اپنے بیگ میں جھانکا۔ اندر رکھے کاغذوں کو ادھر ادھر کیا، نوٹوں کی گڈیاں، یورپ اور امریکہ کے ٹکٹ، انتر راشٹریہ سمیناروں کے نمنترن۔

''سچ کہہ رہا تھا وہ بڈھا ورما'' اگروال نے سوچا، ''کہ دنیا کے بازار میں ہر چیز بیچی اور خریدی جا سکتی ہے۔ میں نے اب تک اپنے آپ کو نہ بیچ کر کیا پایا؟ میرا ایجوکیشن، میرا آرٹ، فلاسفی پر میری مغز ماری...... کیا دیا اس سب نے مجھے؟ تیسرے درجے کے ایک دیہاتی کالج میں غیر یقینی نوکری۔ کالج چلانے والے جاہلوں کو سلام کرتے رہو۔ ان کے بنگلوں پر وقت بے وقت حاضری دیتے رہو ان کے نالائق بچوں کا مفت میں ٹیوشن کرو۔ ان کو اگزام میں اچھے نمبروں سے پاس کراؤ۔ یہ میرا...... میرے آرٹ اور میری فلاسفی کا اکس پلائی ٹیشن ہے۔

انسانوں کو زندہ جلا دینا اگر دھارمک پاگل پن ہے تو میرے ساتھ کیا جانے والا سلوک سا ماجک اتیاچار ہے۔'' اس کی سوچ کا دریا باڑھ پر آیا ہوا تھا۔ ایک جگہ اس باڑھ کا زور کم ہوا تو اس نے پھر بیگ میں رکھے کاغذات پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ میز پر پڑا ہوا خبر کا تراشا اٹھا کر ایک بار اسے دیکھا اور بڑبڑایا، ''میری اپنی بھی کوئی حیثیت ہے کہ نہیں سالی؟''

فکشن ورکشاپ میں کم اور میناکشی کی تھیسیس پر زیادہ وقت دینے والا پروفیسر جگموہن ورما ممبئی میں اس خبر کو پہلے ہی پڑھ چکا تھا کہ اپلے ہاؤس کی ایک جسم فروش پشپا نگر کرنے کتنی چھوٹی بڑی سیڑھیاں چڑھ کر سماج سدھارک کی جگہ پائی اور میونسپل کارپوریشن آف گریٹر بامبے کا الیکشن جیتا۔ ابھی جو خبر کا تراشا ورما کے ہاتھ آیا تھا اس میں شہری ترقیات کے وزیر وامن راو گھورپڑے، کارپوریٹر پشپا تائی اور شیوسینا کی مقامی شاخ کے ایک نیتا کا معاملہ مہانگر کے تعمیری کاموں میں رشوت خوری اور دھوکے بازی اور پرائمری اسکولوں میں بچوں کو بانٹا جانے والا چاول ہڑپ کر جانے کی تفصیلات کے ساتھ درج تھا۔

کسی کے ہاتھ مشرق بعید کے مفرور اسمگلر فرینک اوہارا کی کیس ہسٹری آئی تو کسی کے حصے میں سوامی پرمانند جی مہاراج کے آشرم میں پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کی حاضری کا لیکھا جوکھا۔ ایک لیکھک کو حوالہ کانڈ میں ملوث سیاسی پارٹیوں اور وزیروں کی اطلاعات فراہم کی گئیں تو دوسرے کو کبوتر بازی یعنی انسانی اسمگلنگ کی پروازوں کا چارٹ دیا گیا اور اسی طرح کسی کو مندر مسجد تنازعے میں فریقین میں شامل ایسے مہنتوں ملاؤں کے احوال کی رپورٹ مہیا کی گئی جو کرسیوں پر براجت سوتر دھاروں کے اشاروں پر قانون، مذہب، اخلاق اور انسان، سب کی راہ میں روڑا اٹکانے کو تیار نظر آتے ہیں۔

جگ سا پزل کے ٹکڑے سب کے آگے ڈال دیے گئے، پھر کھیل شروع ہوا ان ٹکڑوں کو جوڑ کر نئی شکلیں بنانے کا۔

ٹکڑوں کو جوڑ کر اور رنگ و روغن چڑھا کر بنائی گئی تصویریں تمام لیکھکوں نے اپنے اپنے

شہر میں ایک خاص غیر ادبی، غیر سیاسی یعنی بالکل غیر متعلق شخص کے حوالے کیں اور اپنے ہوائی ٹکٹوں کو استعمال کرنے کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں پرواز کر گئے۔ اس سفر میں بھی کسی نے اپنے پرانے پارٹنر کو ساتھ لیا اور کسی نے پارٹنر تبدیل کر لیا۔ اس کا ایک الگ قصہ ہے جو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ فی الحال قصہ یہ ہے کہ ملک کے الگ الگ ماحول اور موسم میں لکھی گئی یہ کہانیاں ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے راجدھانی میں بیٹھے وکپش کے چند افراد کے سامنے لائی گئیں۔ انھوں نے مہر بند ٹینڈروں کی طرح صندوق سے موٹے لفافے برآمد کر کے انہیں کھولنا شروع کیا۔

ہر لفافے سے نکلنے والا کاغذوں کا پلندہ جذبات سے عاری چہرے والا، خوب لحیم شحیم ایک شخص اپنے آگے دھری ایک فائل میں دباتا جا رہا تھا۔ لفافوں سے کہانیاں برآمد کرنے والے بھی خاصے غیر دلچسپ نظر آ رہے تھے اور جیسا کہ ہر لکھے چھپے ہوئے کاغذ کو وہ سیاسی جلسے کی رپورٹ، سرکاری یوجنا کا احوال اور پارٹی کے آمد و خرچ کا حساب وغیرہ سمجھتے تھے، یہاں بھی ان کا برتاو کچھ مختلف نہ تھا۔ جب تمام لفافے خالی ہو چکے تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اور فائل کو ہر طرف سے سیل بند کر دینے کا حکم صادر کیا۔

یہ فائل ایک نمبری تالے والے بریف کیس میں بند کر کے دور دکن کے جنگلوں میں کہیں بھیج دی گئی جہاں فائل میں بند کاغذوں پر لکھے متن کی ساخت شکنی کے بعد ایک نیا متن تیار کرنے والا پہلے ہی سے پہنچا دیا گیا تھا۔

یہ ایک غیر معروف ادیب تھا اور پیشے سے معمولی مدرس جسے اس کے شہر میں مخالف پارٹی کے سرگرم ایم ایل اے نے دو ہزار روپے میں کچھ لکھنے کے لیے تیار کیا تھا۔ حکم چند ملکانی کو فون پر اسی نے کہا تھا کہ ناول لکھنا اور پھر اسے چھپوانا میرے بس کی بات نہیں۔

ملک کی ریاستی حکومتوں نے اپنی ثقافتی شعبوں میں مختلف زبانوں کی سماجی، تعلیمی اور سیاسی ترقی کے نام پر جو اکادمیاں بنا رکھی ہیں ان کے سبب ودھان سبھاؤں میں بیٹھنے والے ودھایک اپنے علاقوں کے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فنکاروں سے کسی قدر واقفیت

رکھنے والے ہوگئے ہیں۔ لکھنے پڑھنے والی یہ قوم الیکشن کے زمانے میں ان کے لیے تقریریں لکھنے، ووٹ مانگنے میں مدد کرنے اور ان کے وقت بے وقت نکلنے والے اخباروں کے لیے صحافتی مواد تیار کرنے کی خدمات بھی نہایت معمولی معاوضے پر بلکہ کبھی کبھی صرف چائے پان سگریٹ کے بدلے کرنے کو اپنی خوش بختی سمجھتی ہے۔ چنانچہ ریاستی ودھایکوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے ہونہار افراد سے تعلق بنائے رکھیں۔

کھاڑی میں پھینک دیے جانے والے ناول کی تیاری کے لیے انھیں میں سے ایک فرد کو چنا گیا۔ یہ ایک غیر معروف ادیب تھا اور پیشے سے معمولی مدرس۔ ہالیگاؤں کے کانگریسی ایم ایل اے راجکمار سنتوشی نے اسے دو ہزار روپیوں کے محنتانے پر ایک ایسا عظیم ادبی متن تیار کرنے پر راضی کرلیا تھا جو اشاعت پر یقیناً ملک کے ادب میں ایک کلاسک تخلیق کا مقام حاصل کر لیتا۔

ہوا یوں تھا کہ غریب مدرس جس کا نام، فرض کر لیتے ہیں کہ چندر گپت تھا، چار مہینوں سے تنخواہ نہ ملنے کے کارن خاصا پریشان تھا اور ادھر ادھر سے قرض لے کر اپنا اور اپنے خاندان کے درجن بھر افراد کا جیسے تیسے پیٹ پال رہا تھا کہ اسی زمانے میں سنتوشی نے ہائی کمان کے آرڈر پر ایک خاص کام کے لیے ایک خاص شخص کی تلاش شروع کی اور اس کی نگاہِ انتخاب غریب چندر گپت پر پڑ گئی۔

اس نے اکثر سنتوشی کے لیے تقریریں لکھی تھیں۔ شہر کے اسکولوں کے کئی جلسوں میں سنتوشی نے اسے اچھے خاصے اہم ثقافتی پروگرام کرتے دیکھا تھا۔ ریاست کے بعض اہم ہندی انگریزی اخباروں میں اس کی تحریریں چھپا کرتی تھیں اور غیر معروف ہونے کے باوجود ریاست بھر کے فنکار اسے ایک بہت اچھا مدرس اور ایک بدنصیب فنکار مانتے تھے چنانچہ سنتوشی نے بیچارے اس مدرس پر کچھ احسان کر دینے کی نیت سے اسے بلا بھیجا۔

''ماسٹر جی آئیں تو کہنا کاکا جی نے ابھی بلایا ہے۔'' سنتوشی کے آدمی نے چندر گپت کے گھر والوں کو جتا دیا، ''کہنا، بہت جروری کام ہے، ملنے میں دیری مت کرنا۔''

اسکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی چندر گپت کو کاکا جی کا سندیسا ملا۔ اس نے کھڑے کھڑے چائے کے گھونٹ پیٹ میں انڈیلے اور حکم کی تعمیل میں الٹے پاؤں پارٹی آفس

کی طرف نکل پڑا۔ وہاں پتا چلا کہ کاکا جی کہہ کر گئے ہیں، ماسٹر جی کو بیٹھنے کے لیے کہا جائے۔

وہ گھنٹا بھر وہاں اخبارات الٹتا پلٹتا اور انتظار کرتا رہا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم بھی تھا کہ پتا نہیں کاکا جی نے اس طرح کیوں بلایا ہے۔ اس کی نظر بار بار سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف بھی جاتی اور غیر ارادی طور پر وہ انگلیوں سے میز بھی کھٹکھٹاتا جاتا اور تبھی (شاید اسی کھٹکھٹاہٹ کے سبب) وہاں رکھا ہوا فون بجنے لگا۔

دو تین بار اس نے گھنٹی بجنے دی اور انتظار کرتا رہا کہ آفس بوائے آ کر ریسیور اٹھائے۔ پھر اس نے خود فون کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا کہ ایک دبلا پتلا نوجوان دوڑتا ہوا اندر آیا اور اس نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو، کانگریس پارٹی آفس'' اس نے کہا اور دوسری طرف کی آواز سننے لگا۔ ''ہاں جی، جی ہاں'' کہتے ہوئے اس نے دیر سے انتظار میں پھنسے چندر گپت کی طرف بھی دیکھا، ''ماسٹر جی یہاں بیٹھے ہیں'' وہ بولا تو چندر گپت اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا کاکا جی...... بول دیتا ہوں'' نوجوان نے فون رکھ کر چندر گپت سے کہا، 'کاکا جی بنگلے پر بلا رہے ہیں، بولے ماسٹر جی کو ادرچ بھیج دے۔''

انتظار کی الجھن تکان بن کر چندر گپت کے اندرون میں بکھر گئی۔

''اب بنگلے پر جانا پڑے گا کیا؟'' وہ بڑبڑایا۔

''جانا تو پڑے گا ماسٹر جی'' آفس بوائے میز پر پڑے اخبارات سمیٹتے ہوئے بولا، ''کاکا جی کھاس کام سیچ بنگلے پر بلاتے ہیں۔''

چندر گپت اگلے سفر پر روانہ ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

بنگلے پر ہائی کمان کے دہلی سے آنے والے ایک نیتا سے اس کی ملاقات کرائی گئی۔ جب چندر گپت اس سے ہاتھ ملا رہا تھا تو کاکا جی وہاں سے چلا گیا۔

''ماسٹر جی آپ کو مجھ سے یا مجھے آپ سے بات کرنی ہے'' نیتا نے کہا، ''سنتوشی جی اس معاملے میں کورے ہیں، آپ کو کرنا یہ ہے کہ......''

جو کچھ کرنا تھا، چندر گپت کے لیے بہت آسان لیکن اتنا ہی حیرت ناک بھی تھا۔

''آپ کے منزل پر پہنچنے تک امتحانی پرچے بھی وہاں پہنچ جائیں گے'' اسے بتایا گیا، ''تمام پرچوں سے سوالات چن کر آپ کو ایک جنرل پرچہ تیار کرنا ہے اور بس ...... آپ کا سارا خرچ، پرچہ تیار کرنے کے معاوضے سمیت سنتوشی جی ادا کریں گے اور ایڈوانس ادا کریں گے، سنا ہے آپ کے یہاں چار چار مہینے تنخواہ نہیں ہوتی۔''

اسی وقت کا کا جی اندر آیا۔

''ماسٹر جی آپ چلیے'' اس نے آتے ہی کہا، ''سفر کی تیاری کیجیے۔ ادھر اسکول کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے ایک گھنٹے بعد ملتا ہوں۔''

چندر گپت نے اپنے آپ کو وہاں غیر ضروری جان کر باہر کی راہ لی۔ دوسرے دن اخبار میں کسی کے اغوا کی خبر پڑھتے ہوئے اس نے سوچا، ''میں تو اپنے گھر میں ہوں لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اخبار کی یہ خبر میرے ہی اغوا کر لیے جانے کی ہے؟''

یہ جنوبی بھارت کا ایک کم آباد سرسبز علاقہ تھا۔ چندر گپت کے قیام کے لیے مخصوص بنگلا یقیناً کانگریس ہی کے کسی نیتا، ورکر یا خیر خواہ کا رہا ہوگا جہاں اپنے قیام کے دوران اسے صرف ایک نوکر ہی نظر آیا جو ہندی بولنے میں خاصی کٹھنائی محسوس کرتا تھا اس لیے چندر گپت کھانا پانی یا ضرورت کی کوئی خاص چیز مانگنے تک ہی اس سے بات کر سکتا تھا۔ اپنے کام کے زمانے میں اس نے زبان سے بہت کم کام لیا۔

نمبری تالا لگے ہوئے ایک بریف کیس سے کاغذوں کے پلندوں سے بھری ایک فائل برآمد ہوئی تھی (تالا کھولنے کے نمبر چندر گپت کو بنگلے کے نوکر نے ایک کاغذ پر پہلے ہی سے لکھے ہوئے، تھما دیے تھے)

فائل کے اوپر ایک ہدایت نامہ چسپاں تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

کچھ دنوں میں فائل کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد چندر گپت نے لکھے گئے مواد کے نیچے سرخ روشنائی والی قلم سے لکیریں کھینچنی شروع کیں پھر کچھ دنوں تک وہ اس خط کشیدہ

مواد کی نقل کرتا رہا۔ ضرورت کی جگہ اس نے کچھ الفاظ اور جملے گھٹائے بڑھائے بھی اور اس طرح پہلے سے تیار کچھ ادبی، کچھ صحافتی ٹیکسٹ کو ڈی کنسٹرکٹ کر کے اس نے جو نئی متن سازی کی، پس ساختیاتی نکتے سے وہ بین المتونی بازگوئی کے مترادف تھی۔

ہدایت کے مطابق کام کرتے رہنے کے مزید کچھ دنوں بعد چندر گپت نے بریف کیس سے ملنے والے سادہ کاغذات کو ایک کسے بندھے ناول میں تبدیل کر دیا جس کو کوئی عنوان نہ دینے کی بھی اسے ہدایت کی گئی تھی۔ پھر ایک دن اپنا ٹیبل ورک اس نے بریف کیس میں بند کر دیا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

چندر گپت کی واپسی کے ایک ماہ بعد:

پڑوس کے ایک بچے نے دروازے پر آ کر آواز لگائی، ''گروجی کا فون ہے۔''

چندر گپت نے اخبار لپیٹ کر رکھ دیا اور فون لینے کے لیے لپکا۔ ایک منٹ کی دوری پر رہنے والے اپنے ایک امیر پڑوسی کا فون نمبر اس نے کچھ دوستوں اور رشتہ داروں کو دے رکھا تھا۔

''کون ہے بھئی'' فون کے مالک نے اسے دیکھتے ہی پوچھا، ''بمبئی میں تم نے کسے نمبر دے رکھا ہے؟''

''بمبئی سے فون ہے؟'' چندر گپت نے پوچھا، ''وہاں تو کسی کو میں نے یہ نمبر نہیں دیا۔''

''دیکھو دیکھو، بات کر لو، دیر سے لگا رہا ہے۔''

اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''میں حکم چند ملکانی'' بمبئی سے کسی نے کہا، ''کتنی دیر سے ہیلو ہیلو کر رہا ہوں، کوئی بولتیچ نئیں۔''

''کیا بات ہے؟'' چندر گپت نے پوچھا، ''میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''کیسے پہچانے گا بابا، یہ بتاؤ کہ کلاسک پریس میں جو ناول تم نے چھپنے کو دیا ہے......''

''دیکھیے صاحب'' چندر گپت نے بات کاٹ دی ''میں نہیں سمجھ پا رہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''میں ملکانی سیٹھ بولتا'' ادھر سے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا گیا، ''تم نے جو پستک اِدر چھپنے کو دیا ہے......''

''سیٹھ جی'' چندر گپت نے نہایت ٹھنڈے پن سے کہا، ''میں قصے کہانیاں پڑھتا ضرور ہوں اور اپنے اسکول میں یہ سب پڑھاتا بھی ہوں لیکن ناول لکھنا اور پھر اسے چھپوانا، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ پریس والوں سے معلوم کیجیے اور کہ ناول کس نے لکھا اور چھپنے دیا۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

باب : ۵

راجا دیورائے سنگھ ولد راجا ہرہنس رائے سنگھ ولد راجا...... اس طرح ثقافتی معاملات کے ریاستی وزیر کا شجرۂ نسب مرزا راجا جے سنگھ تک پہنچتا تھا اس لیے گیان، کلا، ساہتیہ اور سوندریہ اس کی رُچی وراثت میں پائی ہوئی جاگیروں اور سیاست بازیوں کے برابر مانی جاسکتی ہے۔ مغل دربار سے انگریزی دربار تک اور وہاں سے راجپوتانہ میں اپنی جاگیر، اپنے قلعے اور محلات تک، پھر گرامن راج کارن سے ضلع اور راجیہ سرکار تک کا اونچا نیچا، نیچا اونچا سفر راجا دیورائے سنگھ کے شاندار ماضی، اس سے زیادہ شاندار حال اور متوقع شاندار ترین مستقبل کی تاریخ بناتا ہے کہ حالیہ برسر اقتدار حکومت میں وہ اپنے علاقے کی کٹر پنتھی، دھرم وادی سیاست کا ایک اہم کردار بھی بن کر سامنے آیا تھا۔ دلّی میں اپنی پارٹی کے خصوصی سنگھٹن تک اس کی بات کا زور چلتا تھا اور اس کی اہمیت مانی جاتی تھی بلکہ راج گڑھ اور ہر سنگھ پور کے عوام اور خواص چاہتے تھے کہ وہ مرکز میں بھی اپنا جھنڈا ابھرائے۔

اس کے گلے میں ہر وقت پارٹی کا انگوچھا اور ماتھے پر زرد تلک ہوتا۔ مونچھیں تنی اور آنکھیں چڑھی ہوئی رہتی تھیں۔ جسم خاصا بھاری تھا مگر کسرتی اور چست جس پر راجستھانی تراش کے لباس اس کے خاص رنگ میں مہذب ہونے کا ثبوت مہیا کرتے۔

راجیہ سرکار نے اسے سانسکرتِک وِبھاگ کا قلمدان سونپ دیا جسے وہ مسلسل تین بار الیکشن جیت کر اپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھا۔ عوامی رابطے کے اس خاص میدان میں دیورائے

نے اپنی سیاسی مذہبی فکر کے تحت راجیہ بھر کے مندروں کا سروے کروا کر انہیں ہندتو کی تعلیم کے مرکزوں میں بدل دینے کے پریاس کیے۔ اس نے راجپوت ثقافت کی ہزار سالہ تاریخ کا تحقیقی منصوبہ تیار کیا اور اس کے نتائج سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ راجستھان کے حالیہ مسلمان زبردستی مسلمان بنائے گئے اصلاً اور نسلاً ہندو ہیں۔ یہاں کی بہت سی مسجدیں پہلے مندر تھیں اور بہت سے مزارات سادھوؤں سنتوں کے آشرم۔

اپنی جاگیر کے کچھ گاؤوں میں عبادت گاہوں کے شدھی کرن کے معاملے کو نمٹانے کے لیے وہ راجدھانی آیا ہوا تھا کہ مانو سنسادھن وکاس منترالیہ میں مرکزی وزیر سے ملاقات کے وقت اسے وہاں منائے جانے والے بھارتیہ سنسکرتی سپتاہ کے ادگھاٹن کا نیوتا دیا گیا۔ اپنے راجیہ میں خود اسی وبھاگ سے جڑا ہونے کے کارن اور ایم ایچ آر ڈی کے سیکریٹری شری بھاٹیا کے اصرار پر اس نے یہ نیوتا سویکار کر لیا۔ ادگھاٹن کے دن راجستھان بھون میں اس نے اپنے راجیہ سے آئے ہوئے سبھی لوک کلاکاروں سے بھینٹ کی، موہنی ہرداس بھی ان میں شامل تھی۔

''منتری جی'' موہنی نے اپنی کسی قدر بھاری لیکن صاف آواز میں کہا، ''آپ کو یاد نہ ہوگا کہ پندرہ سال پہلے میری پاٹھ شالا میں آپ پدھارے تھے اور آپ نے اچھے نرتیہ پر مجھے پرسکار دیا تھا۔''

''اچھا، یہ بات ہے'' دیورائے مسکرایا، ''ہمیں اتنی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں'' کہتے ہوئے اس نے سر سے پاؤں تک موہنی کا گہری نظروں سے جائزہ لیا: چہرہ، سینہ، ہاتھ پیر، قد و قامت، بدن پر جوانی کی پھبن۔

''آپ بڑے لوگ ہیں سرکار!''

''میرے راجیہ میں تم جیسی بڑی کلاکار رہے، یہ بڑی بات ہے میرے لیے۔''

''دھنیہ واد منتری جی'' کہہ کر موہنی نے اس کے چرن چھو لیے۔ دیورائے نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آشیرواد دیا۔

''یہاں بھی تم کھوب پرسکار جیتو اور راجستھان کا نام اونچا کرو۔''

''جرور سرکار''

موہنی نے واقعی ایسا کر دکھایا۔

اس وقت اپنے فن میں وہ بہت اونچے مقام پر تھی کہ راجستھانی نرتیہ کلا کے پردرشن نہ صرف ملک بھر میں کرتی رہی تھی بلکہ اس کا ٹروپ موریشس اور جنوبی افریقہ کے دورے بھی کر آیا تھا۔

سنسکرتی سپتاہ کے دنوں میں خوب چہل پہل رہی اس کی افسروں اور سیکریٹریوں اور منتریوں کے ساتھ چار مرتبہ وہ اس رنگا رنگی میں راجا دیورائے سنگھ سے بھی ملی اور ان ملاقاتوں میں اس کی کلا کے بارے میں راجا جی نے بڑا آدر اور پریم دکھایا۔ سرکاری مہمان خانوں سے ہوٹلوں تک اور ایک دن شری بھاٹیا کے بنگلے کے سرسبز لان پر جہاں رنگین قمقموں سے ماحول جگمگا رہا تھا اور بہت سے مہمان مدعو تھے۔ خوشبوؤں، لہراتے رنگوں اور ہنسی قہقہوں کا طوفان سا آیا ہوا تھا۔ موہنی نے اس لان پر اپنی کلا کا جادو بکھیرا اور اس بار ایسا جی کھول کے ناچی سنسکرتی سپتاہ میں بھی نہ ناچی تھی۔

خوش ہو کر راجا سنگھ نے اسے گلے لگا لیا اور دیر تک لگائے رکھا۔ موہنی نرتیہ کے چکروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے احساس بھی نہ تھا کہ وہ کلا اور سوندریہ کے ایک بڑے رَسِک کی بانہوں میں قید ہے۔

بیٹھیں رات گئے، ڈنر کے بعد راجا دیورائے سنگھ نے موہنی کو اس کی کلا کی اہمیت جتاتے ہوئے اسے یورپی ملکوں میں بھی جا کر بھارتیہ کلا کو بڑھاوا دینے کے لیے تیار کر لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہاں جانے اور کلا کا پردرشن کرنے کے سارے انتظامات میں کروں گا۔

ویسے شری بھاٹیا کا ارادہ تھا کہ موہنی اس رات وہیں رک جائے۔ اس نے راجا سنگھ سے کہا بھی کہ یورپ جا کر اس نرتکی کو گول گول گھومتے دیکھنے سے اچھا ہے کہ اسے یہیں گھما دیا جائے۔

''یوں کریو بھاٹیا'' راجا نے کہا، ''کہ تمہاری پارٹی میں آنے والی کسی اور کلاکار کو یہاں روک لیجو، راج نیتی اور سرکاری نوکری میں اتنا اتاولا پن کھرا نہیں۔''

اس نے موہنی کو اس کے ہوٹل پہنچوایا اور خود جیسا کہا تھا، دوسری کلاکار کے ساتھ بھاٹیا کے بنگلے پر رکا رہا۔

اجنتا ہلز پہنچ کر موہنی ہرداس اپنے سوٹ کے قالین پر دیر تک ناچتی رہی۔ اس کی ماں، ریوا ہرداس نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولی، ''چھوکری، کیا دیوانی تھئی ہے؟''

''ہاں مائی'' وہ چکراتی ہوئی بولی، ''میں دیوانی تھئی ہے۔''

''رک جری، رک، دم لے'' ماں چیخی، ''سارا دن تو گھوم گھوم کرتی ہتی۔''

''میں گھڑیں کھش ہے مائی'' موہنی نے کہا، ''گھڑیں کھش'' کہتے ہوئے اس نے ماں کے ہاتھ پکڑ کر کھینچے اور اسے بھی اپنے ساتھ چکر دینے لگی۔

''ارے، ارے چھوکری'' ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم عورت لڑکھڑائی، ''سچ میں دیوانی تھئی گئی۔'' وہ ہنسنے لگی

''اب میرو ٹروپ یورپ جاوے گا'' موہنی خوشی سے بولی، ''امریکہ جاوے گا۔''

''جاوے، جاوے'' اس کی ماں نے ہاتھ نچائے، ''جرور جاوے، مگر ابھی تو جری دم لے چھوکری''

موہنی ہنستی ہوئی صوفے پر گر گئی۔

وہ روتی ہوئی دیوار سے ٹک گئی۔

موہنی ہرداس دھامن گاؤں کی چھوٹی سی آبادی کے بھی باہر ایک شکستہ چار دیواری اور ٹن کے چھپر کے مکان میں رہنے پر مجبور تھی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا اور اندر سے دھویں کی لپٹیں باہر آ رہی تھیں۔

اس نے دروازے سے لگ کر ایک چارپائی پر اوما چوہان کو بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھی اسے اپنی بپتا سنانے لگی۔

موہنی، اوما نے اس کی عمر کا اندازہ لگایا، چالیس پینتالیس کے پھیر میں تھی لیکن اور دس پندرہ سال بڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر موٹی موٹی جھریوں کا گچھا اور آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ لباس ایک معمولی راجستھانی پتھر توڑنے والی مزدورن کا اور بار بار

کراہتی کھانستی ہوئی۔

''اندر میری مائی ہے'' وہ بولی ''بیچاری بڑھیا میرے ساتھ جیسے جا رہی ہے، وہ مرتی ہے نہ مجھے موت آتی ہے'' اس کی آواز سے کرب امڈ آرہا تھا۔

''وکھت وکھت کی بات ہے میڈم'' اس نے بتایا، ''منّس وکھت سے ہار جاتا ہے۔''

''راجا دیو رائے سنگھ سے پھر کبھی ملیں کہ نہیں؟''

''کون سا راجا؟'' اس نے پوچھا، ''راجا مہاراجا تو میڈم کہانیوں میں ہوتے تھے، اب تو سب چور ڈاکو ہیں۔''

''میرا مطلب ہے'' اوما نے وضاحت کی، ''سنسکرتی و سماج کلیان منتری، جو اب کیندر سرکار میں بھی کسی اونچی جگہ پر ہیں۔''

''وہ کون ڈاکو سے کم ہے'' موہنی نے کراہ کر کہا، ''اسی کے کارن کے تو ہم اس دشا کو پہنچے ہیں۔''

تیسرے ملینیم کے استقبال میں آرٹ اکیڈمی آف پیرس کے ایک خاص فنکشن میں مورس یولیانو نے اپنا اوپیرا ''انڈین راجا'' پیش کیا جسے دیکھ کر تماشائیوں کو کچھ برسوں پہلے کی ایک گھٹنا یاد آ گئی جو وہیں پیرس میں گھٹی تھی۔ بھارتیہ لوک نرتیہ کا پردرشن کرنے والی موہنی ہرداس یورپ کے چند ملکوں میں اپنی کلا کے جوہر دکھا کر پیرس بھی آئی تھی۔ ہندوستانی سفارت کے توسط سے اس نے اکیڈمی کے پروسینیم پر مغربیوں کے دلوں کو موہ لینے والا نرتیہ پیش کیا تھا۔ اتفاق یہ کہ اس نرتیہ کو دیکھنے بھارت کے ایک منتری شری دیو رائے سنگھ بھی پدھارے تھے بلکہ انگلستان میں ایک اہم میٹنگ ملتوی فرما کر وہ پیرس تشریف لائے تھے کہ موہنی ہرداس نرتیہ کلا میں ان کے اپنے راجیہ سے ابھرا ہوا ایک روشن ستارہ تھی۔

راجا سنگھ نے موہنی کو دیکھا تو ایک چنگاری اس کے اندرون میں اچھلی اور شعلہ بن گئی۔ اس شعلے نے راجا کے وجود کو جھلس کر رکھ دیا۔ اسے اپنے دیش کی راجدھانی میں موہنی سے چند ملاقاتیں یاد آئیں۔ پھر جے پور کے ہوٹل ہوا محل میں ہوئے فنکشن کی رات بھی اسے یاد آئی

جب اس نے پہلی بار موہنی کے رقص کرتے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔

کچھ لمحوں کے لیے موہنی کو منتری جی کی حرکت عجیب سی لگی پھر نیلے سبز اور گلابی رنگوں کے کاغذی پرندے کمرے میں پھڑ پھڑانے لگے۔ پورا کمرہ رنگوں، خوشبوؤں اور حرارتوں سے بھر گیا۔ وہ راجا کی ہزار بھجاؤں سے کسی طرح آزاد نہ ہوسکی بلکہ اس گھٹنا کے بعد اس کی چاہت بڑھتی ہی گئی کہ کمرہ ان رنگوں، خوشبوؤں اور حرارتوں سے بھرا رہے۔

راجستھانی چکارے اور دف کی ملی جلی موسیقی اسٹیج پر پسرتی جارہی تھی۔ جوں جوں رقاصہ کی گردش میں تیزی آتی، موسیقی کی لہریں دائرہ دائرہ اسٹیج سے تماشبینوں کے ذہنوں تک کو اپنی روانی میں بہالے جاتیں۔ اسٹیج پر صرف مومی شمعوں کا اجالا تھا اور کبھی کبھی رنگین روشنیوں کا دائرہ رقاصہ پر آپڑتا تھا جس سے اس کے بھاری گھیردار لہنگے میں ٹکے ہوئے چھوٹے چھوٹے آئینے جھلملا اٹھتے تھے۔ اس جھلملاہٹ میں رقاصہ کی آنکھوں کی چمک بھی شامل تھی۔

راجا نے سب کے سامنے موہنی کو اپنی آغوش میں بھرلیا۔ ٹروپ کے لوگوں نے دل میں سوچا کہ موہنی اب بہت اونچائی پر پہنچ گئی ہے۔ وہ مسکرا کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''یہاں سب چلتا ہے بھائی'' کسی نے کہا، ''پیرس میں بھی یہ سب نہ کروگے تو یہاں آئے کیوں ہو؟''

موہنی نے الوداعی ہاتھ ہلا کر ٹروپ والوں سے رخصت لی اور راجا کی کار میں سوار ہوگئی۔ ''جاز'' کے لکوری سوٹ میں پہنچتے ہی وہاں رنگ اور خوشبوئیں اور حرارتیں رقص کرنے لگیں۔

اوپر ''انڈین راجا'' کو مغربی طرز کی اندر سبھا کہا جاسکتا تھا کہ اس کی رقاصائیں پیرس کے کسی نائٹ کلب میں ناچنے والیوں کی طرح صرف ایک شفاف گاؤن پہنے اسٹیج کے بیچ تخت پر براجمان اس گاؤن سے بھی بے نیاز ایک مہاراجا کے گرد واسنا کے جال پھیلائے چکرا رہی تھیں۔ کسی ہندوستانی موسیقار کی دھن بیک گراؤنڈ سے ابھرتی اور بیچ میں بے معنی فرنچ شاعری

کے گانے کی سمفنی کچھ موسیقی اور کچھ لفظوں میں سنائی دیتی۔ راجا جی ایک ایک رقاصہ کو مختلف جنسی آسنوں کا پاٹھ دینے کے لیے گاؤن سے آزاد کرتے جاتے۔

اوپیرا کے ختم پر کہیں سے ایسا شور بلند ہوا جس میں ''مہاراجا کی جے'' جیسے الفاظ سنائی دیے۔ یہ الفاظ موہنی اور راجا دیورائے سنگھ کی تصویروں کے ساتھ بھی چھاپے گئے تھے جب وہاں میڈیا نے پتا لگایا کہ ایک بھارتیہ منتری نے کیسے اپنے ہی دیش کی ایک کلاکار کو غیر ملک میں عیاشی کے لیے استعمال کیا۔ کچھ اخبارچیوں نے تو یہ بے پر کی بھی اڑادی کہ راجا جی اس کلاکار کو فرانس کے صدر کے سامنے ایسے لہنگے میں نچوانا چاہتے تھے جو......

بہرحال اخبارات اپنی اشلیل تصویروں کے ساتھ غیر ملک سے ملک میں بھی آئے لیکن راجا سنگھ کے سیاسی کیریکٹر پر کوئی حرف نہ لا سکے، الٹا موہنی ہرداس اور اس کی ماں نے مقامی اخبار والوں کے الٹے سیدھے سوالوں کے جوابات دیتے دیتے گھبراہٹ اور بے خیالی میں کچھ ایسی باتیں کہہ دیں کہ سارا کیا دھرا ایک کلاکار کے سر آ پڑا اور راج ولاسی کا کچھ بھی نہ بگڑا۔

باب : ٦

رام داس لاہری گنگا پور کے ہنومان مندر کے آنگن سے ایک دم اٹھ کر لوک سبھا میں حکمراں پارٹی کے ساتھ بیٹھنے لائق ہو گیا۔ پہلے تو اس نے ضد کی کہ میں ہاؤس میں بھی لمبا بھگوا کرتا پہن کر اپنے چمٹے کے ساتھ ننگے پاؤں جاؤں گا لیکن قانون کی تھوڑی پروا کرتے ہوئے اس نے کرتے کے نیچے کچھ پہننا اور چمٹا ایم پی بنگلے پر چھوڑنا قبول کر لیا۔ بازوؤں اور گلے سے لیکن اس نے مالائیں نہ اتاریں، نہ ڈاڑھی اور جٹائیں منڈوائیں ہاں، ان کی صفائی کی طرف کچھ دھیان دینے لگا۔

''یہ مسلمان ممبر بھی تو ڈاڑھی میں آتے ہیں یہاں'' اس نے خیال ظاہر کیا، ''ٹوپی کرتا سب پہنتے ہیں۔''

''لیکن کرتے کے نیچے ان کا پاجامہ پوری ٹانگوں کو ڈھانپے رہتا ہے۔'' ایک ایم پی نے مذاقاً وضاحت کی۔

''ہم کہیں کرتا اٹھا کر چلتے ہیں'' لاہری چڑ گیا، ''ارے یہ دھرم سے ہمارا۔''

''پارلیمنٹ میں آنے کا دھرم جرا الگ ہے مہاراج'' اسے بتایا گیا، ''یہاں اب بھی تھوڑا تھوڑا انگریجی کانون چلتا ہے۔''

''مر گئے سالے انگریج'' وہ بولا'' کل جب ہم سبھا میں بھاسن دیں گے اُن کے وِردھ تب سننا تم، سب کو کھری سنائیں گے، ہاں!''

لیکن ہاتھ اٹھانے کے سوا وہ کچھ کرنے لائق نہیں تھا البتہ اکثر وہ پارٹی کے اہم لوگوں کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا۔اس کا اصل کرم اپنے انتخابی حلقے کے مندروں تک زوروں پر تھا۔ادھر ایم پی بنگلے میں، جو اسے پانچ سال کے لیے الاٹ ہوا تھا، اس نے گنگا پور کے بہت سے سادھو بلا بٹھا رکھے تھے جو بنگلے کے احاطے، باغ اور ورانڈے میں آسن جمائے رہتے یا چلم کھینچتے نظر آتے۔ان کے کھانے پینے اور عیش و آرام کا بھی خاص انتظام اس نے کیا تھا۔

لاہری نے سادھو سماج میں رہ کر بہت برے دن گزارے تھے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ میری برادری کے لوگ، جب تک میں اس بنگلے کا مالک ہوں، کسی پرکار کا دکھ نہ جھیلیں اور ہر پرکار سے جیون کا آنند لوٹیں۔سو وہ ایسا کر رہے تھے اور دلّی سے گنگا پور اور گنگا پور سے دلّی، اتر پردیش کی خاص خبریں اور چیزیں لا لے جا رہے تھے۔اس ہیرا پھیری میں لاہری نے اپنی پارٹی سے گٹھ جوڑ والی دوسری پارٹیوں کے ممبروں سے بھی خاصا میل جول بڑھا لیا تھا اور اس طرح کچھ ہی عرصے میں اس کے مستک کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں کہ سوٹ بوٹ میں رہنے والے بھی میری ہی طرح اندر سے بے لباس ہیں چنانچہ اس نے اپنے کرم کا دائرہ اور بڑا کر لیا۔

بجرنگ دل اور شیو سینا کے ممبر اسے اپنے ہی ٹولے کے افراد معلوم ہوتے تھے کیونکہ یہ کبھی کبھی اس کے بنگلے پر حاضر ہو کر دوسرے سادھوؤں کے ساتھ چلم کے دم لگانے اور خاص موقعوں پر تانترک پرکریاؤں میں بھی پیچھے نہ رہتے تھے۔

پہلے بھی سادھ سنگت، سدھی جیسے کرم ممبروں کو خصوصی پرکریاؤں کے لیے اُتسک رکھتے ہی تھے، اب لاہری کے آجانے سے ان میں تیزی آ گئی اور اٹھواڑے پندھرواڑے اس کے بنگلے پر تانترک میلے ہونے لگے۔آج کے میلے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پردھان منتری اور ان کی پارٹی کے دوسرے بڑوں نے بھی شرادھ بھیجا تھا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد گنگا پور اور آس پاس کے کچھ چھوٹے شہر ایودھیا میں آئے دن کی خوف و ہراس پھیلانے والی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کے سبب ایک اہمیت حاصل کر گئے تھے۔نہ صرف گنگا پور بلکہ قریب کے ایک دو اور علاقوں سے مندروں کے مہنت اور سنت چونکہ

ملکی حکومت میں نمائندگی کے لیے پہنچنے لگے تھے، تب سے ان علاقوں میں کٹر پنتھی پارٹیوں کے کرتا دھرتا بھی خوب آنے جانے اور خاصا وقت یہاں گزارنے لگے تھے۔ ایسے میں گنگا پور کے نمائندے رام داس لاہری اور دوسروں کی بن آئی تھی۔ دھرم کرم کا کاروبار خوب چمک اٹھا تھا کہ اب اس میں ملکی سطح کے رہنما ان کے ساتھ تھے اور اکثر ان کی دھارمک وِدھیوں میں شریک بھی ہوا کرتے تھے اس لیے کچھ لاہری کے زور دینے اور بہت کچھ ستا دھاری سنگھ کی سیاسی چالوں کی پیش رفت کے طور پر آج جو پوجا گرانٹ روڈ کے درگا مندر کامپلیکس کے ایک خاص تہ خانے میں رکھی گئی تھی، وہاں سادھوسنت، نیتا گن، بڑے بڑے صنعت کار، گیانی وگیانی اور کچھ کلا کار تک پہنچ کر تہ خانے میں بچھی چاندنی پر بیٹھ چکے تھے۔

پورا ہال دودھیا روشنی اور ایک عجیب سی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ تہ خانے کے زینے کے مقابل ایک اونچی چوکی پر چھت سے بندھا پردہ چوکی کو ڈھانکے ہوئے تھا جس کے پایوں کے قریب پوجا کی سامگری، پھول پھل، پتے اور کئی ہاتھوں والی ایک بدشکل مورتی جس کے ہاتھوں پر دیپ جل رہے تھے۔ چوکی سے لگ کر خوبصورت نقاشی کی ہوئی لکڑی کی چلمن تھی جس کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں آنے والے سبھی لوگ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کررہے اور رہ رہ کر پردے سے ڈھکی ہوئی چوکی کی طرف بھی دیکھتے جارہے تھے کہ ایک سادھو کے پورے روایتی کاسٹیوم میں رام داس لاہری چلمن کی آڑ سے نکلا۔

اس کے جسم پر ایک بسنتی رنگ لنگوٹ ستر پوشی کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بازوؤں، رانوں اور چہرے پر بھبھوت ملا ہوا اور پیشانی پر سیاہ تلک، کانوں میں کنڈل، جٹائیں کھلی ہوئی اور داڑھی بے ترتیب۔

اس حلیے میں شاید ہی کسی نے اسے پہچانا ہو (کہ یہ ملک کی پارلیمنٹ کا ایک سدسیہ ہے)

اس نے ہاتھ جوڑ کر سب کو پرنام کیا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کال پرتی کال سے یہ سِدھ ہوتا آیا ہے کہ ہون کنڈ میں ....'' پھر اس نے کچھ جانوروں، جڑی بوٹیوں اور دوسری وستوؤں کے نام لیے جو سننے والوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔

''......اس شرادھ سے راج کارن میں پھلتا اور برہمن اور شتریہ کے دھرم کو اس کے آنے والے کال کے کرموں سے آج ہی شکتی مان بننے کا سہیوگ ملتا ہے۔''

قریب ہی دیوار سے لگا کر آٹھ دس اینٹیں رکھی تھیں۔ انہیں لاہری نے چوکی کے پاس اس طرح جمایا کہ ایک کنڈ سا تیار ہو گیا۔ اس پر تازہ گوبر کا پلستر کر دیا گیا، سنے ہوئے ہاتھ اس نے اپنے سینے کے بالوں پر رگڑ لیے۔

''اب سبھی ویکتی اس کنڈ کے پاس آدھے گولاکار میں بیٹھ جائیں۔''

لوگ ادھر ادھر سے آ کر کنڈ کے گرد نیم دائرے میں بیٹھنے لگے۔ تبھی لاہری نے تہ خانے میں اندھیرا کر دیا۔ سیاہی میں چوکی کے پاس کھڑی کئی ہاتھوں والی مورتی کے ہاتھوں پر جلتے دیے عجیب پر اسرار منظر پیش کرنے لگے۔

چوکی کا پردہ اٹھا دیا گیا۔

کالی دیوی کی نگن مورتی جو نیم تاریکی میں جیوت نظر آتی تھی، دکھائی دی، کٹے ہوئے سروں کی مالا کے علاوہ اس کے گلے میں کئی مالائیں پڑی تھیں۔ لاہری نے منقش چلمن کی آڑ سے ایک بکرا بھی برآمد کیا جس کے ممیانے کی آواز دیر سے تہ خانے میں آ رہی تھی اور وہاں موجود لوگ چونک چونک جاتے تھے۔

ہون میں آگ جلائی گئی۔

لاہری نے منتر پڑھ پڑھ کر چوکی پر پڑی ہوئی سامگری اس میں ڈالنی شروع کی۔ ہاتھ کے اشاروں سے وہ دائرے میں بیٹھے وِدھی میں شریک ہونے والوں کو مختلف ہدایات بھی دے رہا تھا۔

اس وقت سب آلتی پالتی مارے، آنکھیں موندے، ہاتھ جوڑے، دھیان مگن تھے کہ مورتی کے قدموں سے ایک لمبی تلوار اٹھا کر لاہری نے بکرے کی گردن پر وار کر دیا۔

آتما کو جھنجھنا دینے والی چیخ کے ساتھ بے سر کا جانور تڑپنے لگا اور دائرے میں بیٹھے لوگ کپکپا کر رہ گئے۔

لاہری ایک بے خودی کے عالم میں اپنے کرم میں گم تھا۔ بکرے کی گردن سے بہتا ہوا

خون کنڈ میں گرانے کے بعد اس نے کچھ اور چیزیں آگ میں جھونکیں۔ تہ خانے میں ایک تیز بدبو پھیل گئی۔ ہر طرف دھواں بھر گیا جو وہاں بیٹھنے والوں کو سانس لینے میں دشواری پیدا کرنے لگا۔ دھویں کے لہرانے سے چوکی پر کھڑی کالی کی مورتی گویا حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بُد بُدا بھی رہا تھا۔ جب سارا دھواں لوگوں کے پھیپھڑوں میں بھر گیا اور ان کی آنکھوں اور ناکوں سے بہنے والا پانی انھیں پریشان کرنے لگا تو ان میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ ہون کنڈ میں جلی ہوئی ساگری کی راکھ میں چنگاریاں چمک رہی تھیں کہ لاہری نے تہ خانے میں روشنی کر دی۔ پھر اس نے کالی کے گلے میں پڑی ہوئی مالائیں نکال کر حاضرین میں ایک ایک کر کے بانٹنی شروع کیں جسے لے کر وہ آنکھوں سے لگاتے اور گلے میں پہنتے جاتے۔

اپنے گلے میں مالا ڈالنے کے بعد آخری بچی ہوئی مالا اس نے ایک سرخ کپڑے میں باندھی اور قریب کھڑے ایک تنومند شخص سے کہا، ''یہ پردھان جی کے لیے ہے،'' کہتے ہوئے اس نے کپڑے کی پوٹلی اسے تھما دی، ''یدی وہ اس سے یہاں اُپستھ رہتے تو اس مالا کا اَدِھک لابھ اٹھاتے''

ایودھیا میں شیلا نیاس کے زمانے میں لاہری بہت مصروف دکھائی دیا۔ سنگھ کے بڑوں نے اسے گنگا پور ہنومان مندر میں ڈھیر کیے گئے ترشولوں کا نگراں بنا دیا تھا۔ کئی سرکاری افسران اور پولس اور فوج کے ادھکاری مندر کا دورہ کر گئے تھے اور سب نے سرکار کو اطمینان دلایا تھا کہ ایودھیا کے پرستاوِت رام مندر اور آس پاس کے پچاس کلو میٹر علاقے کے مندروں میں پوجا پاٹ کی ساگریوں اور پرساد کے پھل مٹھائیوں کے سوا کچھ نہیں۔

شیلا نیاس کے لیے اکھنڈ بھارت بھومی سے کارسیوک پہنچنے والے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں وہ ایودھیا پہنچ بھی گئے تھے مگر سیاسی اونچ نیچ، قانونی داؤ پیچ اور ملکی اور غیر ملکی منظر و پیش منظر نے حقیقی عمل کو علامتی عمل میں تبدیل کر دیا۔ اس کاریہ کرم میں حصہ لینے کے بعد جب لاہری گنگا پور سے دلّی واپس آیا تو ایک خبر کانوں کان چلتی ہوئی نشر و اشاعت کی وزارت میں بہت سے اہم اور بہت سے غیر اہم افراد تک پہنچ گئی تھی کہ وپکش کوئی پمفلٹ،

کوئی پوسٹر یا کوئی پستک ایسی چھپو رہا ہے جس میں ......
لکھے چھپے سے اسے دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے بنگلے کے لان میں ہوتی سادھوؤں کی دھوم رلیلا میں شامل ہو گیا۔

اپنے بھکتی یاترا کال میں رام داس لاہری نے گنگوتری سے تربینی تک سادھوؤں سنتوں، اگھوریوں، بھکاریوں، کان کٹوں، سرمنڈوں وغیرہ کئی برادریوں میں دن بتائے تھے۔ کاشی، بنارس، الہ آباد وغیرہ کے چھوٹے بڑے مندروں میں کئی طرح کے انسانی اور غیر انسانی، سماجی اور غیر سماجی تجربوں اور مشاہدوں سے وہ گزر چکا تھا۔ کبھی اکیلا، کبھی دو چار ساتھی سنگتی، کبھی بھکاری، کبھی چور اچکا بلکہ ایک بار تو اسے جسم فروش عورتوں کی دلالی بھی کرنی پڑی تھی اور اسی سادھو مہاراج کے کاسٹیوم میں۔
جب مندر مسجد کی سیاست اور دہشت گردی نے زور پکڑا تو لاہری اس زمانے میں فیض آباد کے ایک گاؤں گنگا پور کے ہنومان مندر پہنچ چکا تھا اور کبھی مندر کی سیڑھیوں پر دھونی رمائے، کبھی مندر کی صاف صفائی کرتا اور خاص پوجا کے موقعوں پر مہنت جی کا ہاتھ بٹاتا نظر آتا تھا۔
مہنت ہرنام داس کو اس نے ایک بار مندر کے پیچھے گاؤں کی ایک بیوہ چمارن بنتو کے ساتھ کچھ پکڑ دھکڑ کرتے دیکھ لیا تھا بس اسی دن سے شروع ہوا اس کا مہنت جی اور بنتو دونوں کو بلیک میل کرنے کا دھندا۔ اس لے دے میں اتفاقاً اسے گاؤں کے سرپنچ کے بھی شامل ہونے کا پتا چلا۔ بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ جتنا اسے چھپایا جاتا، اتنی ہی کھلنے پر اڑی نظر آتی۔ لاہری کے دونوں ہاتھوں میں پرساد کے لڈو آ گئے جو کبھی ختم نہ ہونے والے تھے۔
''یہ انت پرساد ہے'' وہ کہتا، مسکرا کر مہنت کو دیکھتا اور دھیان مگن ہو جاتا۔
یہی پرساد اسے گنگا پور کے ایم پی بن جانے کی صورت میں بھی پراپت ہوا کہ دھارمک کٹر پنتھی سیاست نے اس کو اس لائق پایا کہ گنگا پور انتخابی حلقے میں کچھ سوجھ بوجھ رکھنے والا، سادھو برادری میں رام داس لاہری ہی مہنت پجاریوں، سادھو سنتوں عام جنتا اور پنچایت کے نیتاؤں میں مقبول تھا۔ بنتو اور اس کے پریوار کے کارن پورا پاسی سماج اس کے ساتھ ہو گیا اور

اس حلقے میں اس سماج کے ووٹروں کی تعداد اسے جیت دلانے کے لیے کافی تھی۔

چناو مہم میں ابھی وہ جس گاؤں میں آیا ہوا تھا، وہاں بتو کا مائیکا تھا۔اس کے ساتھ خود بتو اور پاسی سماج کے چند لٹھ باز تھے۔ جد کر کے بتو نے اسے اپنے گھر ٹھہرنے پر راجی کر لیا۔

''ہم تو مندر، دھرم سالا میں ٹھہرنا ہی اُچت جانت ہَین۔'' لاہری نے کہا،'' تیاگی جوگی کو گھر کے گدے سے کا کام؟''

''کِنتُ آپ پرچار کے لیے نکلے ہیں،'' کسی نے کہا،''اور کل گاؤں بھر میں آپ کو گھر گھر درسن دینا ہے اور بھاسن بھی۔''

''اسی لیے'' بتو اپنی بھاری آواز میں بولی،''گھر کا آرام جروری ہے۔'' کہہ کر اس نے لاہری کو کھٹولے پر بٹھا دیا۔خود سامنے بیٹھ کر اس کے پاؤں ایک تسلے میں رکھے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے لگی۔

ابھری ہوئی سانولی گولائیوں کے بیچ ایک کالی لکیر دور تک اسے دکھائی دی۔ پیروں پر پڑتی ٹھنڈک تھکے ہوئے جسم میں چیونٹیوں کی طرح سرسرانے لگی۔

بتو نے سر اٹھا کر گہری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے اس کے پاؤں رگڑے۔ دھول مٹی میں اٹے پیروں کا میل پانی میں گھلنے لگا۔ پاؤں دھونے میں مگن بتو کی کنپٹیوں پر چند سفید بال اسے نظر آئے۔

''چالیس کی جرور ہوگی'' اس نے سوچا،''پر دِکھتی نہیں۔'' اسے مندر کے پیچھے دیکھا ہوا منظر یاد آیا۔مہنت جی بتو کو سختی سے جکڑے ہوئے اس کا ماس نوچ ڈال رہے تھے۔

کہ بتو نے اس کے دونوں پیر تسلے سے اٹھا کر کھٹولے کی پائنتی کر دیے۔ وہ بری طرح چونک پڑا۔

تھوڑی بہت تانترک وِدّیا جاننے کے کارن وہ ہون کنڈ اور چرکنڈ کے سمبندھ کو بھلی بھانتی سمجھتا تھا۔

چناو کے بعد جب لاہری نے ایم پی بنگلے میں سادھوؤں کا ٹولا بٹھایا تو بتو بھی ایک

سادھوی کی طرح وہاں رہنے لگی۔ کچھ وقت ماحول کو سمجھتے گزر گیا۔ پھر یوں ہوا کہ بنتو کو کسی شے نے آ لیا۔ اماوس پونم کی راتوں کو وہ گھومنے جھومنے لگی۔ ہری ساڑی پہنے، بال کھولے، آنکھوں میں گہرا کاجل اور ماتھے پر بڑا لال ٹیکا لگائے۔ وہ لان میں ننگے پیر گھومتی رہتی۔ اس کی اسی کیفیت میں دوسرے سادھو مورچھل ہلاتے اور چمٹے بجاتے، بم بم کے نعرے لگاتے اور وہ ان کے گھیرے میں مست ہو کر چکراتی رہتی۔

یہ خبر باہر نکلی تو شرڈھار کھنے والوں کا، خاص طور پر عورتوں کا تانتا بندھ گیا لیکن یہ سب تماشا ایک خاص وقت میں کیا جاتا یا ہوتا اور اس کے لیے بنگلے کے پیچھے نوکروں کا ایک کمرہ مقرر کر لیا گیا تھا۔

اس رات چاند کو پورا گہن لگنے والا تھا۔ لاہری کچھ ودھا یکوں سے مل کر واپس آیا تو اس کے ساتھ بسنتی کرتیاں پہنے پانچ عورتیں بھی تھیں۔ ہاتھوں اور گلے میں منکے پڑے ہوئے، ننگے پیر، ان کے بال سر پر جوڑوں میں بندھے تھے۔ وہ سیدھا بنگلے کے پیچھے اسٹور روم میں انھیں لے گیا۔ بنتو کچھ کھلی، کچھ ڈھکی ننگے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی اور ہونٹ نیم وا تھے۔

پانچوں عورتیں اس کے گرد بیٹھ گئیں۔

وپکش کی نیتا کے وِرودھ میں یہ تنتر رچا گیا تھا اور لاہری کے کہنے کے مطابق سپھل بھی ہو جاتا لیکن ممبئی سے آئے ایک فون نے اسے الجھا دیا کہ لوک سبھا میں جتنے جوگی بھوگی جمع ہو گئے ہیں، ان کے وِرودھ میں ایک پُستکا چھاپ کر ملک بھر میں بانٹی جا رہی ہے اس لیے لاہری نے گنگا پور کے ہنومان مندر کے مہنت کو فون کر دیا کہ وہاں جو چیزیں جمع ہیں، ادھر ادھر کر دی جائیں۔ باہر آ کر اس نے لان میں آسن مارے بیٹھے ننگ دھڑنگ وبکتیوں سے کہا کہ ابھی کچھ دنوں کے لیے بھیرو ناتھ کے نام کا جاپ کر کے سنگم کی بھیڑ میں غائب ہو جاؤ۔ پھر اس نے اسٹور روم میں موجود بنتو اور اس کے ساتھ بیٹھی پانچ سادھویوں کو باہر نکالا۔ بنگلے کا نگراں اس کا خاص آدمی بن چکا تھا۔ اسے بھی ساتھ لے کر اس نے دو تین کاریں منگوائیں۔ بہت سا

سامان ان میں لدوا کر بٹو کے ساتھ اپنی ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ گیا۔

''ہم کیلاش پربت جارہے ہیں۔'' اس نے ڈرائیور سے کہا، '' کچھ دن وہاں بتائیں گے پھر دیکھیں گے واپس آ کر اس سفید چمڑی والی کے معاملے کو......''

باب : ۷

راجندر سنگھ عرف بھیّا جی نے اپنی آبائی زمین اور اپنے سرحدی کاروبار کی دیکھ ریکھ اور گاؤں میں اپنی دھونس جمائے رکھنے کے لیے اور آس پاس کے چند دیہاتوں سے سو سوا سو نوجوان کو یکجا کر کے جو ٹولا بنا رکھا تھا، اسے بلّم بھالے، لاٹھیاں اور دیسی بناوٹ کی بندوقیں دے کر کسان سینا کا نام دیا تھا۔ موٹر سائیکلوں اور جیپوں میں سوار اس سینا کے سپاہی دن چڑھے ہی گاڑیوں کے شور کے ساتھ چیختے چلاتے گاؤں کے چوپال میں آ جمع ہوتے۔ وہاں پیپل کے سایے میں بنے ایک چھوٹے سے مندر کی پری کرما کرتے اور گاڑیاں روک کر وہیں سایے میں بیٹھ جاتے۔

آج انہیں ایک خاص مہم پر جانا تھا اس لیے وقت سے کچھ پہلے ہی سب وہاں آ چکے اور بھیا جی کا انتظار کر رہے تھے۔

''کچھ کھبر ہے مالے کی؟''

''مالا تو بھیا جی ہی جانت ہَین۔''

''اور سنا ہے، رات اِنس پتّر آئے رہن۔''

''اُنھی کا کچھ مالا لگت ہے۔''

''وہی ہوییٔ.....''

''آوت ہَین'' کسی نے ہڑبڑا کر کہا، ''گڑیا آ گئی۔''

کچے راستے پر ایک جیپ اچھلتی نظر آئی۔ ڈرائیور منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا۔ ساتھ کی سیٹ پر ایک لمبی گھنی مونچھوں والا، آنکھوں پر کالا چشمہ اور بال تیل لگا کر سر سے چپکائے ہوئے، سانولے چہرے پر خشونت۔ یہ تھا راجندر سنگھ عرف بھیا جی۔

پیچھے ایک اور جیپ...... پولس کی...... چلی آ رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک ساتھ رکیں۔ پیپل کے پاس کھڑے ہوئے کچھ بندوق دھاری لڑکے دوڑ کر اگلی گاڑی کی طرف بڑھے۔ ان کے پاس آنے تک بھیا جی اتر چکا تھا۔

بندوق دھاری اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ اتنی دیر میں پولس جیپ سے ایک اور مونچھ والا انسپکٹر کی وردی میں ان تک آ چکا تھا۔

''دھیرو'' بھیا جی نے ایک دیوہیکل جوان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''پنڈت جی کے ساتھ جاے کے ہے، ان کے آدمی بھی رہی ہن۔ اِن جے کی تر پھ نسانہ بتاوین، اوکا کام کر دے کے، سمجھ گیا؟''

''ہاں بھیا جی'' دھیرو نے پنڈت کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''گاؤں کے باہر جاے کے پڑیے کا؟''

''پنڈت جی جدھر بول ہن، ادھر جاے کے، کچھو وچار کرے کی جرورت نا ہیں۔''

''جی بھیا جی، کتنے لڑکے لئی لوں؟''

''کیوں پنڈت جی'' بھیا جی نے انسپکٹر سے پوچھا، ''تین چار ٹھو سے کام چل جیئے؟''

''پکّا نسانے والا ہو تو ایکئی بہت ہے۔'' پنڈت نے کہا۔

''ٹھیک ہے دھیرو، تین لڑکن ساتھ لئی لے۔'' وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔

''پکّے نِسانے والے، سام کے رپوٹ اچھی ملے چہیے، اب ہم جائیں'' کہتے ہوئے وہ جیپ میں بیٹھ گیا اور پنڈت سے بولا، ''ان کی پھکر نہ کرے کے، اِنھان تمرا کام جرور کرِ ہن، اب کل ملیں گے۔''

اس نے ڈرائیور کو جیپ اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔

دوسرے دن پٹنہ کے اخباروں میں دلت سنگھٹن اور کھدان مجور سمیتی کے نیتا سکھ لال بابو کے پولس سے مسلح تصادم میں مارے جانے کی خبر بڑے زور سے شائع ہوئی۔ انسپکٹر پنڈت کا بیان یہ تھا کہ ہمیں بابو کے آس پاس بوڈو آندولن کے اُگروادی نظر آئے تھے اور یہ اطلاع پولس کو پہلے ہی سے مل چکی تھی کہ بابو اُگروادیوں سے ہتھیاروں کا بڑا سودا کرنے والا ہے۔ بابو سے پوچھ گچھ کے دوران اس کے ساتھ موجود ایک نامعلوم شخص نے پولس کے ایک سپاہی پر دھار والے ہتھیار سے حملہ کر دیا۔ بچاو کے لیے پولس کو کارروائی کرنی پڑی۔ نتیجے میں ایک خاصی زوردار جھڑپ کے بعد بابو کو پولس کی گولی سینے پر لگی اور نامعلوم افراد فرار ہو گئے۔

اس خبر سے کئی گھنٹے پہلے دھیرو نے بھیا جی کو اچھی رپورٹ دے دی تھی اور وہ بے چینی سے پنڈت کا انتظار کر رہا تھا لیکن کارروائی کو قانونی رنگ میں رنگنے کے لیے پنڈت کو بہت وقت صرف کرنا پڑ گیا اور وہ آدھی رات ہی کو بھیا جی سے مل سکا۔

''سب ٹھیک ہو گوا بھیا جی'' اس نے اطمینان کا اظہار کیا، ''اب آپ کے الیکسن میں کونو ٹانگ نہیں آڑا سکت۔''

''اور تہار کھمر اب دوسرے کنوا نہیں جاب، بن پھکر تھانہ میں سگریٹ اڑاؤ یا گھر جائی کے لگائی کو پریسان کرو، جاؤ''

پنڈت نے مسکرا کر اسے سلیوٹ کیا۔

سکھ لال کو نیتا ماننے والے چپ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے بعد کے ذمے داروں نے اپنے سنگھٹن اور سمیتی کی طرف سے کورٹ میں اپیل داخل کر دی کہ پہلا گاؤں کے تھانہ انچارج سکمار پنڈت کی رپورٹ کی سچائی معلوم کی جائے۔ انہوں نے ایک بڑے جلوس کے ساتھ پہنچ کر وکیل کے ذریعے اپنی درخواست داخل کی۔ پولس اور پہلا گاؤں کے بھیا جی کے خلاف نعرے لگائے۔ اس جلوس میں سکھ لال کی جوان بیوہ رگھیا کو آگے کر دیا گیا کہ کورٹ عورت پر رحم اور کارروائی میں جلدی کرے۔

پنڈت اس شام پھر بھیا جی سے ملا جو اپنے آبائی بنگلے کے سامنے خاردار تاروں سے

گھرے بہت بڑے میدان میں اپنی سینا کے جوانوں کو پھرتی سے آتے جاتے، ٹولیوں میں کھڑے باتیں کرتے، ہتھیاروں کی صفائی میں مصروف اور بارودی میگزین کو بکسوں سے نکالتے اور بکسوں میں بھرتے دیکھ رہا تھا۔ پنڈت سیدھا اس کی طرف بڑھا آیا۔

''کا بات ہے پنڈت جی'' بھیا نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا، ''منہ کا ہیں سوجا ہے؟''

''کمیتی والوں نے مکدما ٹھونک دیا ہے'' پنڈت نے بتایا ''اب سکھ لال کے مالے کی جانچ کرنے پٹنہ سے لوگ آئے والے ہین۔''

''آوَن دو'' بھیا جی نے بے پروائی سے کہا، ''اِدھر لے آنا اُنھان کے اور کورٹ میں کون ہے؟ او سردار جی، او کے بھی بلا لینا، ساندار داوت کر دیں گے سالوں کی۔''

''بھیا جی، ماملا دلت سنگھٹن کا ہے'' پنڈت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، ''پھر او سالے سکھ لال کی پتنی کے آگے لائے ہین اور تم تو جانت ہو کے کانون کے اور تن سے کتنی ہمدردی ہے۔''

''سب مالوم ہے، سب مالوم ہے'' بھیا جی دانت پیس کر بولا، ''سب کے دیکھ لیں گے، جرا کل ہم کو راجدھانی جا کے آ جائی دو۔''

پہلا گاؤں میں کوئلہ کھدان کی وجہ سے آدی واسیوں اور دلتوں کی آبادی بڑھ گئی تھی اور سب مزدور مائننگ کمپنی کے طرفدار اور کئی انتخابوں سے مرکز میں برسر اقتدار پارٹی کے خلاف متحدہ محاذ بنانے والوں کے امیدواروں کو اپنے کثیر ووٹوں سے جیت دلائے جا رہے تھے۔ کمپنی کے بہت سے حصے دار ریاست کے بڑے صنعت کار، پونجی پتی اور راج نیتی کے ماہر افراد تھے جو گاؤں میں کسان سینا بنانے والے بھیا جی کی ہر سیاسی بازی کو پلٹتے آ رہے تھے چنانچہ آخری راستہ اس کے لیے یہی رہ گیا تھا کہ آدی واسیوں اور دلتوں کے ووٹوں کو کمپنی کی طرف پہنچانے والے ان کے نیتا سکھ لال کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ آج کے اخباروں میں سکھ لال کی موت کی خبر پہلے صفحوں پر چھپ گئی تھی۔ بھیا جی کے لیے کھدان مزدوروں کے ووٹ خرید لینا اب آسان ہو گیا تھا اور ان کے ووٹ نہ بیچنے کی صورت میں وہ کسان سینا سے خدمت لینے کے

لیے بھی تیار تھا لیکن فی الحال یہ روڑا راستے میں آ پڑا تھا کہ سکھ لال کے بعد اس کے ماتحتوں نے رگھیا کی ہمدردی میں انسپکٹر پنڈت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا اور معاملے کی قانونی جانچ کی مانگ کر دی تھی۔

ویسے بھیا جی کو اطمینان تھا کہ کچھ دھیرج سے میں اس کام کو نمٹا لوں گا۔ پھر اس کا پٹنہ جا کر اپنی پارٹی کے کچھ اہم لوگوں، سرکار کے سیکریٹریوں، چھوٹے بڑے افسروں، یہاں تک کہ کچھ کلرکوں سے بھی ملنا ضروری تھا۔ ان ملاقاتوں کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مکھیہ منتری سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی لیکن میٹنگ ہال میں کرسیوں کی آخری قطار میں بیٹھے کھنج منترالیہ کے ایک ہیڈ کلرک سے اس نے کچھ اہم باتیں کیں اور شریمتی رابڑی دیوی کی طرف ایک ترچھی نگاہ ڈال کر ہال سے باہر نکل گیا۔

رگھیا پر کیا بیتی اور کیا بیتنے والی تھی، یہ الگ قصہ ہے جو اپنے گھر، اپنے لوگوں اور اپنے سماج میں رہتے ہوئے اس پر گزرا۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ مختصری مدت کے لیے کوئی واقعہ بہت بڑا نظر آتا ہے جیسے رگھیا کے پتی سکھ لال کا واقعہ جو بھیا جی اور انسپکٹر پنڈت جیسے بڑے لوگوں سے جڑا تھا لیکن دو چار دن اس واقعے کی گرمی رہتی ہے اور معاملہ کہیں دب دبا جاتا ہے۔ رگھیا کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ایک ارب سے زیادہ آبادی والے ملک میں اسے شمار ضرور کیا گیا تھا لیکن وہ کسی شمار میں نہیں تھی۔ اسے سامنے لا کر سکھ لال کے معاملے کی قانونی جانچ کروانے والے بھی دھیرے دھیرے منظر سے غائب ہو گئے تھے، صبح و شام کی روزی روٹی کے چکر نے اسے پھر کھدان کمپنی کی ٹوکریاں ڈھونے میں مصروف کر دیا تھا۔

عورتوں کی ہمدردی کرنے والے قانون کو بھیا جی نے پولس اور عدالت اور منترالیہ ہر جگہ سے خرید لیا۔ پٹنہ سے آئے ہوئے کئی گن مان لوگ اس کے بنگلے پر قیمت وصول کرنے آتے رہے۔ اس دوران کسان سینا بھی بڑی سترک رہی اور کمپنی کے مزدوروں اور یونین لیڈروں کے ساتھ ساتھ کمپنی کے حصے داروں کی بھی نگرانی کرتی رہی بلکہ کمپنی کے کچھ لوگ بھیا جی کے بنگلے پر بھی دکھائی دیے۔

سنیتی کمار مشر سے بھیا جی نے معاملہ بنا لیا تھا۔ یہ شخص کمپنی کے چھوٹے حصے داروں کو اکٹھا کر کے اپنا گٹھ جوڑ الگ بنا چکا تھا۔ اسی الگاو سے بھیا جی نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ سو الیکشن سے پہلے اس نے ایک زمانے کے اپنے ہم جماعت مشر کو ہموار کرنا شروع کر دیا۔ نتیجے میں سکھ لال کے واقعے کے بعد جانے مانے لوگوں کے ساتھ وہ بھی دعوتوں میں شامل رہا اور اب بھی سیشن جج گجیند رسنگھ تیغا کے ساتھ وہ بھیا جی کے بنگلے ہی پر موجود تھا۔

''ہم سرکاری لوگ ہیں بھئی'' تیغا نے بوتل کا سنہرا مائع گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا، ''راج نیتی کے بارے میں اپنی رائے ہم کو رِزَرو رکھنا پڑتی ہے۔'' اس نے گلاس اٹھا کر شیشے کے آر پار دیکھا، ''یہاں تو ہم بھیا جی اور پنڈت جی کے کارن بیٹھے ہیں۔''

''کمپنی میں آپ کے بھی تو شیئر ہیں، سردار جی'' مشر نے اپنا گلاس بھرنا شروع کیا، ''اور جیسے دلت، آدی واسی، ویسے ہی سردار اور مسلمان''

''ہاں تو ہم نے کب کہا کہ ہم آپ کے اور بھیا جی کے ساتھ نہیں''

''یہ ہوئی نا بات!'' بھیا جی نے جج کے شانے پر ہاتھ مارا، ''بس تم پھیسلا سنانے سے پہلے ہماری پھریاد سن لیا کرو۔''

سب ہنسنے لگے۔

''بڑے شیئر ہولڈروں کے پاس ووٹر بھی جادا ہیں'' مشر بولا، ''کنتو ہمارے ووٹر ہمارے ساتھ ہیں اور ان کی تاکت تو کم کر ہی سکتے ہیں ہم۔''

''ہم ای چاہت ہین'' بھیا جی نے کہا، ''کہ جرا انھان پر اپنا پربھاو پڑ جائے تو کا کھرابی ہے۔''

''کا ارادہ ہے تہار؟''

''دھیرو'' بھیا جی نے جواب دینے کی بجائے دھیرو کو مخاطب کیا، ''سب تیاری ہے کی ناہیں؟''

''تیاری تو ہر وکھت راہتی بھیا جی'' دھیرو نے قریب آ کر کہا، ''بس آ گیا چیپے''

''ہاں تو بجھو''، اب وہ تیغا، پنڈت اور مشر کی طرف متوجہ ہوا اور ان تینوں کے ہاتھوں میں شراب سے بھرے گلاس تھے، ''ادھر ہمرے کھیتوا کے پیچھے ایک جھوپڑا گاؤں بسے لگا ہے'' وہ کہنے لگا، ''آپ تو جانت ہین کی پہلا گاؤں کی جمنیا ہماری کھاندانی جاگیر ہے۔ اب او جھوپڑا

گاؤں میں کمپنی کے ووٹر رہے لاگے ہین اور ہم چاہت ہین کی او گاؤں ہٹا دوں۔''
''یانے تم سالے ان کے ووٹر کم کرنا چاہتے ہو؟''
''اور کا؟'' بھیا جی بولا، ''اور اب پنڈت جی اور شری تیگ بہادر جی'' کہتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑے، ''آپ سے بنتی ہے کہ کچھ دن چھٹی پر چلے جاؤ تم ہم اپنا کام استیل سے کر سکیں۔''
تیغا پنڈت اور مشر کا منہ دیکھنے لگا۔
''بھیا جی کا مطلب ہے'' پنڈت نے سمجھایا، ''کہ ہم اپنا کام بے پھکر ہو کر کریں۔''
''اچھا، اچھا'' تیغا نے ہنس کر کہا، ''ہم بھی بہت دنوں سے اُدھر مہاراشٹر میں اپنے بڑے گرودوارے میں درشن کو جانے کی سوچ رہے ہیں۔ چھٹی لے کر گرو دربار میں حاضری لگا آئیں گے۔''
''ای بات پے ایک پیگ اور لو'' بھیا جی نے نئی بوتل کھولی۔

پانچ چھے سو جھونپڑوں میں پانچ سات ہزار کی آبادی تو ضرور ہو گی جس کے کئی لوگ اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور باقی جلے ہوئے جھونپڑوں سے کچھ فاصلے پر ایک میدان میں جمع رونے دھونے، چیخنے چلانے اور ہائے وائے کرنے میں مصروف تھے۔ رات کسی جھونپڑے کے آگے جلتے الاؤ کی چنگاری شعلہ بن کر اس آبادی کو راکھ کر گئی تھی اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ آگ بجھانے والے، پولس اور گاؤں کے مکھیا پنچ وغیرہ ادھر کی خبر لینے دن چڑھے ہی آ سکے۔
یہ کھیتوں اور کھدانوں میں کام کے کرنے والے گریبی ریکھا سے نیچے کے لوگ تھے اور زمینداروں اور کمپنی والوں کے وعدے پر انہوں نے یہاں اپنی کچی پکی آبادی بسا لی تھی جس پر ایک دن راجندر سنگھ عرف بھیا جی نے اپنی ملکیت ہونے کا دعوا کر دیا تھا۔
پتا چلا کہ تھانے میں کچھ ہی سپاہی ہیں جو جانچ کی اتنی بڑی کارروائی پوری کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ بھیا جی کی کسان سینا نے اتنے عرصے میں وہاں پہنچ کر جلے بجھے ملبے کو ایک طرف ڈھیر کر دیا۔ اس کام کے دوران سینا کے سپاہی رونے چیخنے والوں کی طرف بندوقیں تانے کھڑے رہے۔

''اپنا برتن بھانڈا اٹھاؤ'' یکا یک دھیرو سامنے آ کر چیخا، ''اور ادھر کمپنی والن کے بنگلے میں چلے جاؤ۔''

دو دن تک ملبہ صاف کیا جا تا رہا۔ سینا کے بندوق دھاری بھی وہاں جمے رہے دھیرو کا حکم چلتا رہا۔

کم ووٹوں ہی سے سہی، پپلا گاؤں اور آس پاس کے چند اور گاؤں کے ملے جلے انتخابی حلقے سے راجندر سنگھ نے ایم ایل اے کی سیٹ جیب لی۔ سمتا پارٹی کے ساتھ مل کر اس نے بہار ودھان سبھا کے وِرودھی دل میں بیٹھنا پسند کیا اور جنتا دل سرکار کو گرانے میں زور لگانے والوں کے ساتھ وہ بھی شامل رہا لیکن تخت پر پہنچتے ہی حالات نے جو پلٹا کھایا، اسے راج نیتی، بھگوان کی مرضی اور پپلا گاؤں میں قتل کیے جانے اور جل مرنے والوں کے سگے سمبندھیوں کی ہائے وائے کا ملا جلا اثر سمجھنا چاہیے۔

ہوا یوں کہ کھیتی کے چوپایوں میں اچانک ایک وبا پھوٹ پڑی۔ ان کے کھروں کے بیچ لال لال چکتے پڑ جاتے اور دو چار دنوں میں ان سے لال پیلا مواد بہنے لگتا۔ اس کے بعد ٹانگیں سوج جاتیں اور جانور زمین پکڑ لیتے۔

ودھان سبھا میں پشو پالن منتری کو وپکش نے خوب آڑی ٹیڑھی سنائی اور مویشیوں کے علاج کے لیے ملک اور بیرون ملک سے معالج بلائے گئے لیکن وبا کا زور کم نہ ہوا، یہاں تک کہ چمڑا اُدیوگ اور ہڈی سینگوں کے بازار میں تیزی آ گئی۔ دودھ چارے اور پشو کھادیہ کے تمام سرکاری ٹھیکوں، ادا نہ کیے جانے والے بلوں اور مویشیوں سے متعلق تمام تجارتی غیر تجارتی معاملات میں اتنی ہیرا پھیری کی گئی کہ کیا اکثریت اور کیا اقلیت، سرکاری کرسی رکھنے والے ہر پارٹی ممبر کی بن آئی۔ ستا دھاری اور وِرودھی، دونوں پکش ایک دوسرے کی سہایتا سے دودھ، دہی، گوشت، گوبر، خون ہر چیز کی دلالی میں مصروف ہو گئے۔

پپلا گاؤں کے ایم ایل اے نے بھی خوب ہاتھ رنگے اور...... اور بہت کچھ ہوا۔ اس میں واقعی مویشیوں کے سہارے جینے والے انسانوں نے اپنے سڑ گل کر مرتے جانوروں کے

ساتھ پرارتھنا کی کہ سرکاری ویگیانکوں کے تیار کردہ انجکشنوں سے جو وہ گایوں بھینسوں کو دودھ اور بیلوں بکروں کو قوت تولید بڑھانے کے لیے لگایا کرتے تھے، پھیلنے والی بیماری خود ان ڈاکٹروں اور منتریوں کو لگ جائے۔ راجندر سنگھ بھیا جی ایک اخبار کے شور وغل کے مطابق چھوٹا ناگپور کے آدی واسی منتری کے ساتھ چمڑا گھوٹالے کی ایک بڑی دلالی میں حصے دار نکلا۔

پہلا گاؤں کے برہمنوں نے اس کا حقہ پانی بند کرنے کا اعلان کر دیا کہ ''دنیا سے اورت مرد کا بھید بھاو مٹے لگا ہے'' بھیا جی نے اپنے سہیوگیوں کے ایک جلسے میں کہا، ''کنتو ہم آجو، چمڑے چمڑے میں انتر کی بات کرت ہین۔ ارے، گائے بھینس سب مرت جات رہین، ان کا ہڈی چمڑا، کھون گوبر، دیس کے اُدیوگ میں ہم نے لگا دیا تو کون سا دھرم کے کھلاپ کام کیا؟''

لیکن سی بی آئی کی جانچ نے ثابت کر دیا کہ اس گھوٹالے میں جانوروں کو ایک خاص مقصد کے لیے قتل کیا جا رہا تھا۔

یہ سن کر سکھ لال کی ماں چلائی، ''ارے جو پاپی انسان کا کھون کرت ناہیں چوکتا، اُو گیّا ماتا کا بھی کھون پی سکت ہے!''

جانچ پڑتال کمیٹی کے آدمی ہر طرف پھیل گئے۔ وہ پہلا گاؤں بھی آئے۔ بھیا جی نے ان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انسپکٹر پنڈت اور سیشن جج تیغا نے مہمانوں سے ذاتی ملاقاتیں بھی کیں۔ بہت کچھ لین دین ہوا، وعدے وعید ہوئے مگر فیصلے کے دن کمیٹی کا سکواڈ آدھمکا۔

''اِنھان سب بھی سالے سرکار ماں بکے ہوئے ہین'' بھیا جی کی رائے۔

کسان سینا کا کمانڈر دھیروا کیلے میں بار بار آ کر کسی اچانک اقدام کے لیے اسے تیار کرتا رہا لیکن چونکہ اس زمانے میں سینا کے سپاہی کھیتی باڑی اور کھیتی کے جانوروں کے ساتھ پریشان تھے اس لیے

''ہم اپنے دوسرے گاؤں سے آدمی بلا لیت ہین۔''

''اسکواڈ چلا جائے تو......''

اسکواڈ بھیا جی کو لے گیا۔

کمپنی کے بڑے شیئر ہولڈروں نے خوشی کے جام لنڈھائے۔ چھوٹے حصے داروں کا نیتا مشر بھی اس خوشی میں شامل تھا۔ دلت سنگھٹن کے نئے ذمے داروں نے کمپنی والوں سے سکھ لال کے معاملے کی جانچ دوبارہ شروع کروانے کی بات کی لیکن جشن کے شوروغل میں بڑے چھوٹے دونوں حصے دار اُن کی سنی اَن سنی کر گئے۔

باب : ۸

ممبئ پونے روڈ پر کھنڈالا گھاٹ کی چڑھائی ختم ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر ایک پٹرول پمپ ہے جس سے لگا ہوا راستہ شہری وکاس منتری شری وامن راوگھور پڑے عرف اپا کے گاؤں جوگواڑی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ راستہ ابھی نیا نیا پکی سڑک میں تبدیل کیا گیا ہے۔

آگے پیچھے دوڑتی چار امیسڈر کاریں اس راستے پر مڑیں۔ پٹرول پمپ پر کام کرنے والے چھوکرے یکجا ہوکر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''اپا کے بنگلے پے جاتے سب'' ایک لڑکا

''کوئی میٹنگ بٹنگ ہے کیا؟'' دوسرا

''مجا کرتے ہیں سالے بنگلے پے'' تیسرا

''منتری ہے بھیا، کچھ مجاک ہے کیا!'' چوتھا

سب ایک ساتھ ہنسنے لگے۔

اگلی کار میں وڈالا (ممبئ) کا شیوسینا شاکھا پرمکھ گووند اکلکرنی اپنے چار مددگاروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر تین اور آگے کلکرنی اور ڈرائیور۔ کار کے بونٹ پر دونوکوں والی سنہری گوٹ لگی بھگوا جھنڈی پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''اپا بی پھار بھار بھاری مانس آہے۔'' پچھلی سیٹ سے آواز آئی، ''یہ ایک دم اِدھر

کاے کو بلایا؟''

''کچھ آپتی نئیں'' آگے سے کلکرنی بھاری آواز میں بولا، ''کوئی ٹینڈر ہنڈر کا مالا لگتا ہے میرے کو۔''

''پن وہ ٹینڈر تو سالے کانگریس کو ملنے والے ہیں۔''

''اپا پھار بھاری مانس آہے۔'' وہی بولا جو پہلے بھی اس طرح اپا کی تعریف کر چکا تھا، ''میں بولا نا اِدر اُپ مکھیہ منتری سے مل کر اپا نے کوئی تو بھی بڑا گیم کھیلا ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں'' کلکرنی نے کہا، ''ابھی سب مالوم ہو جائیں گا۔''

تبھی پیچھے والی کار ساتھ آ کر دوڑنے لگی۔ کلکرنی نے اس کار میں جھانکا۔ ڈرائیور کی طرف سے دوسری کار میں کوئی پوچھنے لگا، ''ارے کون سے کھڈّے میں لے جا رَے دادا؟''

''ابے بھکیا'' کلکرنی نے آواز پہچان کر ہنستے ہوئے کہا، ''کھنڈالا کے کھڈّے سے بچ گیا، سالے، شکر کر اب اپا کے بنگلے پر تیرا کھڈّا ابھرتا میں'' پھر وہ اپنے ڈرائیور سے بولا، ''چل رے نندو، آگے نکل سالوں کے۔''

دوسری کار میں ممبئی کر آندولن کا کچھ پر بھاکر اور اس کے کرگے بیٹھے تھے۔ اس آندولن کے لوگ شیو سینا، بھاجپا اور ایسی ہی کٹر پنتھی پارٹیوں سے مل کر بمبئی میں باہر سے یعنی دوسرے راجیوں سے آ کر بس جانے والوں کی ہکال پٹی کرنے کے لیے آئے دن جلسے جلوس، ہڑتالیں اور توڑ پھوڑ کیا کرتے تھے۔ اپا کو ایم ایل اے بنانے میں ان کا بڑا سہیوگ تھا اس لیے خاص موقعوں پر آندولن کے اہم افراد کو وہ اپنے گاؤں ضرور بلاتا۔

''آئی لا'' اچانک کار اچھلی تو ڈرائیور بڑبڑایا، ''منتری کے گاو کا رستا اِتا کھراب کیسے رے سالا؟''

''رستا کھراب نئیں ہے سالے'' پاس بیٹھا ایک سیاہ رُو شخص بولا، ''تو جرا سنبھال کے چلا'' پھر وہ پیچھے بیٹھے پر بھاکر سے مخاطب ہوا، ''کاے ناتا، ادر کا ہی ادگھاٹن ہے کیا؟''

''اب یہ تو اپا کے بنگلے پر چ مالوم پڑیں گا۔''

''میرے کو لگتا ہے'' پربھاکر وضاحت کرنے لگا، ''اُدر دو ن دِوس پہلے پارلیمنٹ نیوز میں اپا کا بھی نام آیا ہوتا۔''

''آئی لا، کیا پھینک پھاک دکھایا تھا سالا لوک سبھا کے اندر۔''

''پن وہ تو کوئی پستک کا ماملا تھا۔''

''ارے ویڑیا'' پربھاکر بولا، ''میرے کو ماہتی ہے، اپا نے اس پستک میں انٹریس لیا تھا۔''

''اپا کا پستک وستک سے کیا کام؟''

''پیچھے کی گاڑی میں'' پربھاکر نے کہا، ''اُدر ملکانی سیٹھ دادار والا بھی آ ریلا ہے۔ اس کو اکھا ڈیٹیل مالوم ہے۔''

تیسری کار میں جس کے بونٹ پر سنہری حرفوں میں لکھی ''مہاراشٹر شاسن'' کی پلیٹ لگی تھی لیکن جھنڈی، پر پلاسٹک کور چڑھایا ہوا تھا، ڈرائیور کے ساتھ مشین گن لیے ہوئے باڈی گارڈ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر صرف دو ہستیاں براجمان تھیں۔ شری وامن راو گھور پڑے اور سیٹھ حکم چند ملکانی۔

''ہم کو تمہارا سیکریٹری بولا تھا۔'' ملکانی کہہ رہا تھا، ''اُدر کلاسک والے سے بات کرو۔''

''اس نے تماری بات تو مان لیا نا، سائیں''

''نئیں مان کے دیتا تھا سالا''

''اس کو پھون گیا تھا چھوٹیا کا'' اپا سمجھانے لگا، ''تب جاکے وہ مانا۔''

''کیا دھمکی بمکی دیا تھا؟''

''اور کیا'' اپا نے مسکرا کر کہا، ''سب کام آسانی سے نئیں ہوتے سائیں، ہر ٹائپ کا آدمی جیب میں رکھنا پڑتا ہے۔''

''ابھی اپن اِدر کا ہے کے واستے جما ہوتا؟''

''لپھڑا ایک دم گھتم نئیں ہوا ابھی'' اپا بولا، ''دلّی سے میرے کو ایک کال آیا ہے۔''

''دلّی سے؟''

''ہاں'' اپا نے سر ہلایا، ''چناؤ سامنے آ گیا ہے، ایسے میں یہ سالا پستک کا لپھڑا نکل گیا اور دو چار منٹے اَجون سا پھ کرنے کے ہیں۔''

''کونتے منٹے؟''

''ارے وِچ کھاڑی سپھائی کا، پھلائی اوور کا، ہور وہ سالی پشپا نگر کر کا'' کہہ کر اپا نے کار کے باہر تھوک دیا۔

شہری وکاس منترالیہ کا سچیو، آکاش اینڈ آکاش بلڈرز کے انجینئر اور ٹھیکے دار اور بھوانی کی چال، وڈالا کا دادا چھوٹیا، یہ تھے چوتھی کار کے سوار۔ ان میں صرف سچیو اور انجینئر ہی آپس میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں کر رہے تھے، باقی چپ چاپ اس طرح کار میں ٹھنسے تھے گویا انہیں جیل لے جایا جا رہا ہو حالانکہ سب کی زبانیں کھجا رہی تھیں اور وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن ایک دوسرے کے حلیے اور صورتیں دیکھ کر خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک چھوٹیا نے سچیو کے شانے پر، جو اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، ہاتھ رکھتے ہوے اسے مخاطب کیا، ''ساہیب، اور کیا ملکانی سیٹھ کو بھی بلایا ہے؟''

سچیو نے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھتے اور اپنے اس طرح مخاطب کیے جانے پر دل ہی دل میں برا مانتے ہوئے روکھے پن سے کہا، ''مالوم نئیں، کون ملکانی؟''

''ارے وِچ'' چھوٹا کھل گیا، ''دادر والا حکم چند ملکانی، ہمارا پھون جانے پر تو اس کو وہ سالا پستک ملا تھا۔''

''مالوم نئیں تم کیا بات کرتا۔'' کہہ کر سچیو آگے دیکھنے لگا۔

چھوٹیا نے شانے اچکائے اور جیب سے تمباکو چونے کی ڈبیا نکال کر ہتھیلی پر کھینی مسلنے لگا۔

''مہا نگر سماچار'' کا رپورٹر راجے شرما اپنے دوست دلیپ ورما سے ملنے آیا ہوا تھا۔ جہاں کسی طرح اسے پتا چلا کہ دلیپ کے پتا پروفیسر جگموہن ورما نے ممبئی کے اخباروں میں چھپی کسی خاص خبر پر کچھ دنوں پہلے ایک فکشنل ورک کیا ہے۔ اسے ''خبر پر فکشنل ورک'' کے نام سے

چونکا۔ اسے حال ہی میں دوردرشن کی پارلیمنٹ نشریات کا ایک منظر یاد آ گیا جس میں ممبئی میں چھاپے جانے والے کسی اپنیاس پر ....

وہ کبھی کبھی پروفیسر کو نمستے ومستے کرتا رہا تھا۔ اس نے مزید جانکاری کے لیے جال بچھایا،

''ان سے بھینٹ ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔''

''پاپا تو آج یونی ورسٹی کے کسی فنکشن میں ہیں یار، اور ان کی جلد واپسی پاسبل نہیں۔''

''مجھے ان کا موبائل نمبر دے'' اجے بولا، ''میں ان سے بات کرلوں گا۔''

پروفیسر کی کسی بات سے سراغ پا کر اور ماہتی اور جن سمپرک کے محکمے کے ایک کلرک سے مل کر وہ ماہم کے ایک معمولی درجے کے پریس کلاسک پرنٹرز تک پہنچ گیا اور وہاں سے ....

پولس والوں کو ملکانی کے دروازے پر دیکھ کر اجے لفٹ کے پاس ہی رکا رہ گیا۔ چند ثانیوں بعد اس نے دروازہ کھلتے اور دستکیں دینے والوں کو اندر جاتے دیکھا۔

''یہ لوگ اتنی جلدی معاملے کی تہہ تک کیسے پہنچ گئے؟'' اس نے سوچا، ''اصل سراغ تو مجھے بھی بائی چانس ہی مل گیا ہے، کیا میں بھی دستک دے کر اندر چلا جاؤں؟''

ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ پولس والے باہر آتے دکھائی دیے۔

''کیا بات ہے!'' وہ خود سے بولا، ''کیا ملکانی اندر نہیں؟''

وردی والے لفٹ کی طرف آئے۔ اجے نے یوں ظاہر کیا گویا ابھی ابھی لفٹ سے باہر نکلا اور کسی خاص فلیٹ کی تلاش میں ہو۔ لفٹ نیچے سرک گئی تو وہ پچاس بی کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھولنے والا نوکر تھا۔

''سیٹھ جی ہیں گھر پر؟''

''نہیں'' نوکر نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''کب مل سکتے ہیں؟''

''مالوم نئیں، وہ بھائر گیا ہے۔''

''بھائر مطلب؟''

''مجھنے ممبئ سے بھائ۔''

''یہ پولس والے اِدر کاے کو آ ئے تھے؟'' اجے کی پیشہ وارانہ رگ پھڑ کے بغیر نہ رہ سکی۔

سوال سن کر نوکر نے پھر اسے پہلے کی طرح دیکھا۔

''وہ بھی سیٹھ سے ملنے کو آ ئے تھے۔''

''اچھا، سیٹھ واپس کب ملیں گا، بتا سکتے ہو؟''

''یہ میرے کو نئیں مالوم، وہ پرت کب آ ئیں گا۔''

''ہم مر جا ئیں گا منتری جی'' ملکانی بولا، ''ہمارا سب دھندا چوپٹ ہو جا ئیں گا۔''

''دیکھو سیٹھ'' اپا نے اسے سمجھایا، ''تم نے پستک میں انٹریس لے کر بڑا کام کر دیا میرا، اب میں تم کو مرنے کیسے دیں گا، پولس ہلس کی پھکر نئیں کرنے کا۔ میں ابھی پاٹل کو پھون کر کے بولیں گا وہ تماری پھیکٹری کے اندر جھانکنے کو بھی نئیں آ ئیں گا۔''

ملکانی اپنے سرخ پھولے ہوئے چہرے سے پسینہ صاف کرنے لگا۔

''اِدر جو گواڑی تم سب کو کاے کے واستے بلایا میں؟'' اپا نے ایک ایک کی طرف دیکھا، ''آ کاس بلڈر کو تو برج کا مالا دیکھنے کا ہے،'' اس نے انجینئر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''ہور بھکیا اُنے نانا، تم دونوں نے وہ کھاڑی سپھائی کے ٹھیکے دار کو سنبھالنے کا'' کہہ کر وہ چھوٹیا کی طرف پلٹا۔

''انے چھوٹیا'' کہتے ہوئے اس کے لہجے سے نفرت ٹپک رہی تھی، ''تو وہ رنڈی کو دیکھ۔ اس نے جو دودھ چاول گھوٹالے میں میرے بیٹے کا نام لے لیا ہے نا......''

ریاستی سرکار کی یوجنا کے مطابق ریاست بھر کی پرائمری اسکولوں کے نچلے درجوں میں پڑھنے والے بچوں کو روزانہ آدھا لیٹر گاے کے دودھ کا پاؤچ اور ایک ماہ میں تین کلو چاول بانٹنے کی دھوم دھام نے پیٹ بھرے سیاستدانوں کو چونکا دیا کہ لاکھوں کا مال اس طرح مفت میں غریبوں کے گھر پہنچ رہا ہے۔ تو اُن دھانیہ کے گوداموں کے افسروں، گرام پنچاتوں

میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے ممبروں نے دودھ اُتپادک سہکاری اداروں اور چاول پیدا کرنے اور گرینوں گوداموں میں رکھنے والے سیٹھوں سے معاملہ کرلیا۔ دیہاتوں شہروں میں اناج بیچنے والی سہکاری دکانوں کے مالکوں سے لے کر اسکولوں میں دودھ اور چاول پہنچانے والے ٹرک ڈرائیوروں، حمالوں اور شکشن منڈل کے ممبروں تک، سب نے مدرّسوں کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ ملک میں پیدا ہونے والے دودھ کے ایک ایک قطرے اور چاول کے ایک ایک دانے کی اہمیت وہ اسکول اسکول جاکر مدرّسین کو سمجھانے لگے۔ پھر جس دھوم دھام سے دودھ کی تھیلیاں اور چاول کے تھیلے اسکولوں میں اتر رہے تھے، اس میں کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ دونوں چیزیں چند مہینوں میں یک لخت اسکول میں آنی بند ہوگئیں۔

لیکن مسلسل بانٹے جانے والے دودھ اور چاول کی لیس رپورٹنگ مدرّسین سے کرائی جاتی رہی۔ بچوں کی بوگس فہرستوں پر خود مدرّسین آڑے ترچھے دستخط کرکے اپنا ریکارڈ سچا رکھنے کی کوشش کرتے اور اسکولوں سے کچھ بھی بچوں میں تقسیم نہ کیا جاتا۔

چمن راو امن راو گھورپڑے اَن دھانیہ پوروَٹھا کھاتے میں ہول سیل اتھارٹی کے نام سے مشہور تھا۔ تمام کلکٹروں اور تحصیلداروں اور سرپنچوں اور کھادیہ واٹپ کے ادھیکاریوں کو اس نے ٹھینگے تلے دبا رکھا تھا کہ باپ کی منسٹری زوروں پر تھی۔ اسکولوں میں دودھ اور چاول نہ بانٹے جانے کے زمانے میں ان کے بانٹے جانے کی رپورٹیں منگوا کر اس نے گایوں کے تھنوں میں ابھی نہ اترنے والے دودھ اور کھیتوں میں ابھی نہ اگنے والے چاول کی قیمت چکا کر اس گھوٹالے کو دبانے کی کوشش ضرور کی جسے ماسٹروں کی کچھ یونینوں کے لیڈروں نے سرکاری دربار میں شکایتیں کرکے اسمبلی میں بحث کا موضوع بنا دیا تھا۔

راجیہ پراتھمک شکشک کمیتی کے کرتا دھرتا اور بہت سے مدرّسین پشپا نگر کر اپنا ہمدرد ماننے لگے تھے۔ دودھ چاول گھوٹالے کو لے کر جب کمیتی کے ممبران اس سے ملے اور انھوں نے اعداد و شمار، آمد و خرچ اور کاغذی دفتری کارروائی کا لیکھا جوکھا مع ثبوت اس کے سامنے رکھ دیا تو کارپوریشن کی ایک عام سبھا میں اس نے شہری وکاس منتری کے بیٹے چمن راو

گھوڑ پڑے کا نام لے لیا کہ یہ شخص

چھوٹیا دادا نے اپنے سنگھاسن کی پشت پر دیوار سے لگی شیوسینا کے نیتا کی بڑی سی تصویر کے ماتھے پر تلک لگا کر اسے پرنام کیا اور سنگھاسن پر براجمان ہو کر اپنے سامنے دورویہ کھڑے مصاحبوں کو دیکھنے لگا۔ سب نے نمن میں اپنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

''کاے باتمی آہے رہے لانڈ گیا؟'' اس نے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سیاہ فام سے پوچھا۔

''دادا، بائی تو ئیں ملی پن اس کا اسٹامپ ملا تھا۔''

''یہ کون رے؟''

''لال کشن ساونت'' جواب ملا، ''مجوروں کا نیتا ہے اور پشپا کا ڈمی کارپوریٹر۔''

''تو یہ سالی ساونت کے کہنے میں ہے۔''

''ہو دادا''

''اس کا ٹھکان ملا کیا تجھے؟''

''ڈھولکیا مل کی مجور چالی کے سامنے والی ستھار کالونی میں اس کا بنگلا ہے، دادا''

''ہور وہ ڈمی؟''

''وہ پن ساتھ میں رہتا، دونوں میں کچھ لپھڑا دکھتا میرے کو۔''

''دونوں کو اٹھا کے منگا اِدر'' چھوٹیا نے حکم صادر کر دیا۔

پشپا نگر کر عرف دھنو رانی میں وَیجنتی مالا سے جو تھوڑی بہت مشابہت پائی جاتی تھی، پلے ہاؤس سے کارپوریشن ہال تک کے سفر میں کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اسے دھنو رانی پکارنے والے تو بہت پہلے پیچھے چھوٹ چکے تھے۔ اب پشپا تائی نگر کر میڈم اور مہیلا نیتا جیسے نام اور القاب اس کی پہچان بن گئے تھے۔ ممبئی کی وسعت، بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے میں نام اور صورتیں اہمیت نہیں رکھتیں۔ کھولی فلیٹ، بنگلا، کرسی، منچ، پد جیسی چیزوں اور مرتبوں کو یہاں اہمیت دی جاتی

ہے۔سو مزدور لیڈر رایل کے ساونت کی رہنمائی ہی میں سہی، اس کا امیج کچھ کا کچھ ہو گیا تھا بلکہ ٹیچرز یونین کے ذمے دار تو اس کی بہت عزت کرتے نظر آتے تھے (شاید کچھ بھلا ہو گیا ہو گا ان کا پشپا میڈم کے ہاتھوں)

اس وقت وہ اپنے بنگلے کی ایک کھڑکی کے پاس آئی تھی کہ سامنے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی گئی دیوار پر اس کی نظر پڑی جس پر طرح طرح کے اعلانات اور اشتہارات لکھے اور رنگ برنگے پوسٹرز چپکے ہوئے تھے۔ دیوار کے اُدھر ڈھولکیا مل ہے جسے سرکار نے مردہ قرار دے دیا ہے۔ایک زمانے میں ساونت کے ساتھ وہ اسی مل کے کمپاؤنڈ میں مزدوروں کی رہائشی چال میں رہنے چلی آئی تھی کہ سماج میں عورتوں کا بھلا کرنے والے مہیلا وکاس گٹ میں اسے شامل کر لیا گیا تھا۔

جلسے جلوس ہڑتالیں دھرنے پولس مزدور مل مالکان میٹنگیں سوال جواب مانگیں نعرے چاہتیں امیدیں

مہیلا وکاس گٹ کی اکپش امیدوار مہانگر پالیکا میں کارپوریٹر ہو گئی۔ساونت نے اسے کاغذوں پر ''سہی کرنا'' سکھایا۔کس کاغذ پر دستخط کرنے ہیں، کس پر نہیں کرنے ہیں، اس کا فیصلہ بھی زیادہ تر ساونت ہی کرتا اس لیے جنتا میں وہ پشپا نگر کا ڈمی مشہور ہو گیا۔

باب : ۹

کٹک کے بڑے گرجا سے فادر فلپ نے آ کر دھام پور کے اچھوتوں آدی واسیوں کو اجتماعی بپتسما دیا تھا اور ان کی بڑی آبادی یسوع کی معصوم بھیڑوں میں شامل ہو گئی تھی۔

یہ واقعہ ملک کی آزادی کے ساتھ ہوا تھا اس لیے دھام پور کا گرجا اب کم وبیش نصف صدی پرانا ہو چکا تھا مگر لوگ اب بھی اسے نیا چرچ کہتے تھے چنانچہ نئے چرچ کی گولڈن جبلی کے موقع پر بڑے گرجا سے اسّی سالہ فادر فلپ کے ساتھ بہت سے دوسرے پادری، ننیں اور مشنری کے غیر ملکی افراد بھی آئے تھے، دھام پور میں تہوار کا سماں تھا۔

جھوپڑوں اور کچے پکے مکانوں کی آٹھ دس گلیوں اور ایک چوپال کا گاؤں رنگین کاغذی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ مکانوں کی دیواریں سفیدی سے پتی ہوئی تھیں اور آنگنوں کی منڈیر جیسی حد بندیوں پر کاغذی پھولوں کے گملے سجائے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہی دروازوں کے آگے موم بتیاں اور دیے روشن کیے جا رہے تھے اور اڑیا میں یاد کرائی گئی انجیلی دعاؤں کا ہر گھر میں گا گا کر ورد کیا جا رہا تھا۔

آج جبلی کے تیسرے دن فادر فلپ کا گاؤں میں آگمن تھا۔ گاؤں کے سارے جیک اور جان اور میریاں اور کرسٹینائیں تقریبات کے لیے تیار کیے گئے میدان میں جمع ہو رہی تھیں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کٹک سے بلائی گئی پولس کی ٹکڑیوں کو بھی ادھر ادھر گشت کرتے دیکھا جا سکتا تھا۔

دھام پور میں کالنگاراج کے زمانے کا ایک تاریخی شیو پاربتی مندر بھی تھا جس میں اِستھاپت کسی دھات کی مورتی آدھے شیو اور آدھی پاربتی کا بیک نظر درشن کراتی تھی۔ آج یعنی نئے چرچ کی گولڈن جبلی کے ہفتہ بھر بعد اس مندر کے استھاپن کا ڈھائی ہزارواں برس ایک تہوار کی طرح منایا جارہا تھا۔ پوری کے شنکراچاریہ کے اسسٹنٹ یعنی دوسرے مہامہنت شری آدی شری کمل ناتھ جی مہاراج یہاں پدھارنے والے تھے۔ اڑیسہ راجیہ کے بڑے بڑے مندروں کے بے شمار سادھوسنت اور سب سے بڑھ کر بھارتیہ جنتا پارٹی کے پرَوکتا غلام اصغر مہدی صاحب اپنی تشریف آوری سے مندر کی سالگرہ کی شوبھا بڑھانے والے تھے۔

مندر کے آگے سجائے گئے وِراٹ منڈپ میں ہندوؤں مسلمانوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا اور لوگوں سے زیادہ پولس والے یہاں جگہ جگہ مستعد نظر آرہے تھے۔

دھام پور میں تہوار کا سماں تھا۔

فادر ایلیا براؤن کو آسٹریلین پیس پریچرز نے نئے چرچ اور دھام پور کے نوعیسائی لوگوں کی مذہبی اور سماجی ذمہ داریاں سونپی تھیں اور براؤن کو اس دور افتادہ گاؤں میں قیام کیے دس برس ہونے آئے تھے۔ اس کی بیوی گریسی، دو بیٹے جم اور ٹم اور ایک بیٹی کم گرجا کے احاطے میں دیے گئے ایک انگریزی بناوٹ کے بنگلے میں اس کے ساتھ رہتے تھے (براؤن کے بچے بھونیشور کے ایک مشن اسکول میں پڑھتے اور چھٹیوں میں دھام پور آجاتے تھے) تین چار نوکر عورتیں مرد اور بنگلے کے سامنے سرونٹ کوارٹرز میں بہت سے نوعیسائی ضرورت مند جو آس پاس کے دیہاتوں سے آکر یہاں یسوع کی بھیڑوں میں شامل ہوجاتے، براؤن کے ساتھ رہنے والے جان پڑتے تھے۔

ان سب نے مل کر چرچ کو دلھن کی طرح سجادیا تھا اور اب وہ فادر فلپ اور دوسرے مہمانوں کا انتظار کررہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں خاصی چہل پہل تھی۔ بھاجپا کے بڑے ادھیکاری اور مہدی صاحب

کے علاوہ راجیہ کی دوسری کٹر پنتھی پارٹیوں کے نیتا اور کاریہ کرتا وغیرہ بھی مہمان تھے۔اس لیے ان سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے مطلب کے شخص سے ملنے چلے آرہے تھے۔

دھام پور کا تحصیلدار سرکاری نوکر ہونے کے باوجود کھلے طور پر برہمن وادی سیاست کا حامی اور آفس میں یہ بڑا تلک لگا کر آنے والا ویکتی تھا۔اس وقت وہ مہدی صاحب کے سامنے علاقے کی سماجی، سیاسی رپورٹ لیے حاضر تھا جس میں اس نے صاف لفظوں میں غریبوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر عیسائی بنائے جانے کی خبر دی تھی۔

''روپیا بڑی چیز ہے صاحب'' مہدی نے مسکرا کر کہا،''لوگ اپنا دھرم ایمان اس کے لیے بیچ دیتے ہیں۔''

''ان لوگوں کا کوئی دھرم ایمان نہیں ہے۔'' آئی اے ایس آفیسر بولا،''انھیں روپیا چاہیے تاکہ یہ روٹی خرید سکیں۔''

''گویا اصل اہمیت روٹی کی ہے۔''

''روٹی پیٹ میں ہو تو آدمی دھرم اور راج کارن سب کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔''

''دھرم اور راج کارن'' مہدی صاحب بڑبڑا کر رہ گئے۔

سنڈے پریئر کے بعد فادر فلپ دو پادریوں کے سہارے اٹھ کر منبر پر آئے انھوں نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی۔ چرچ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اور سیکڑوں انسانوں کی موجودگی کے باوجود سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''یسوع مسیح کے دامن میں پناہ لینے والو'' فادر نے تقریر شروع کی۔

آرتی کے بعد کمل ناتھ جی مہاراج نے سورن چھتر سنگھاسن پر آسن جمایا۔منڈپ میں ہزاروں بھکت پیشانیوں پر بھگوا رنگ کی پٹیاں باندھے ان کا ویاکھیان سننے کے لئے ویاکل تھے۔

''یہ دلت'' مہاراج نے آرمبھ کیا،''یہ شودر، منونیتی کے انسار ہمارے چاکر ہیں،اب یہ ایک پر دھرم کو اپنا کر اور مول بھارتیہ دھرم سے منہ موڑ کر ہماری چاکری سے بھاگنا چاہتے ہیں کیونکہ ادھرم واد راج کارن نے انھیں انوسچت جاتی بتا کر ہمارے برابر بلکہ ہم سے اونچا استھان دینے کا نرنیہ کرلیا ہے اس لیے......''

جم، ٹم اور کم نئے چرچ کی گولڈن جبلی منانے آئے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انھی نے بنگلے کی کھڑکی سے گاؤں میں بھڑکتی ہوئی آگ دیکھی۔

''ممی ...... ممی'' انہوں نے چیخ چیخ کر اپنی ماں کو پکارا۔

گریسی سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے گاؤن بدن پر ڈالا اور اپنے کمرے سے باہر آ کر بچوں کی طرف دوڑی۔

''وہ آگ ......!'' بچے ایک ساتھ چیخے۔ انھوں نے کھلی کھڑکی سے باہر گریسی کو کچھ بتایا۔

نو عیسائی دلتوں کی آبادی پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھی اور شعلے نئے چرچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لوگوں کے چیخنے چلانے، رونے پیٹنے اور دوڑنے بھاگنے کا شور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ تبھی فادر الیا براؤن گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''او، گاڈ!'' اس کی آواز بمشکل نکلی، ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

بچے زور زور سے چیخنے لگے۔ گریسی نے دوڑ کر انہیں لپٹا لیا اور خاموش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

تبھی سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے کئی لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور انھوں نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

براؤن نے گریسی کو کمرے میں ٹھہرنے کا کہہ کر چرچ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ گریسی نے اس کی آستین پکڑ لی۔

''نہیں، ادھر مت جاؤ''

''وہ لوگ چرچ میں چھپنے کے لیے آ رہے ہیں۔''

''نہیں، یہ دوسرے لوگ نظر آتے ہیں۔''

''دوسرے لوگ ......؟''

''انھوں نے مشعلیں اٹھا رکھی ہیں اور ان کی پیشانیوں پر دیکھو، لال لال پٹیاں بندھی ہیں۔''

دروازہ پیٹنے والوں نے کلھاڑے مار مار کر چرچ کا دروازہ توڑ دیا۔ ان میں سے کئی

لوگ براؤن کے بنگلے کی طرف بڑھے۔

''ممی ...... ! وہ اِدھر ہی آ رہے ہیں'' ایک بچہ چیخا۔

گریسی نے دوڑ کر دروازے میں سٹکنی چڑھا دی۔ کھڑکیاں بند کر دیں اور کمرے کے بیچ بچوں کو لے کر کھڑی ہو گئی۔

براؤن دروازے سے پیٹھ لگائے ''کیا کروں، کیا نہ کروں' کے سوالوں میں الجھا تھا، تبھی کھڑکیوں پر باہر سے ضربیں پڑنے لگیں۔ پرانی لکڑی کے فریم ٹوٹ کر گرے اور باہر سے شعلوں کے شرائے کمرے میں گھس آئے۔

دروازے پر مسلسل پڑنے والی کلھاڑوں کی ضربوں نے دروازے کے ساتھ براؤن کی پسلیاں بھی توڑ دیں۔ ایک ہجوم اسے ڈھکیل کر اندر گھس آیا۔

دو بچے ڈر کر بے ہوش ہو چکے تھے اور تیسرا سکتے میں تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے زور سے لات ماری اور گریسی کو گھورتے اسے ادھر ادھر سے نوچتے شور مچا کر اس کے گرد وحشیوں کی طرح ناچنے لگے۔

پھر گالیوں اور قہقہوں کے شور میں بہت سے مسٹنڈے گریسی پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور واسنا کے ننگے ڈرامے کا ایکٹ شروع ہوا۔

وہ چیختی چلاتی رہی۔ خود کو چھڑانے کی اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن وہ کئی تھے اور شیطان ان کے سروں پر سوار تھا۔ اس لیے گریسی کی چیخ پکار اور جد و جہد بے سود رہی۔

ڈراما بہت دیر تک چلتا رہا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ گوری میم مردہ ہو چکی اور چت پڑی چھت کو تکے جا رہی ہے تو انھوں نے بے ہوش بچوں کو کھینچ کر اس کے پہلو میں ڈال دیا۔

باہر آ کر انھوں نے گھر کو آگ لگا دی اور نو عیسائی ننوں کے ہوسٹل کی طرف دوڑے۔ یہاں بھی وہی آگ خون اور واسنا کا کھیل انھوں نے جی بھر کے کھیلا اور وحشیانہ نعرے لگاتے رہے۔

پردھان منتری کے ساتھ رکشا منتری نے بھی جلے ہوئے دھام پور کا دورہ کیا لیکن ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر اور دو تین بار آبادی کے گرد چکر لگا کر کٹک کی طرف پرواز کر گئے۔

وہیں انھوں نے تحصیلدار کو طلب کیا جس کے جوابات سن کر اندازہ ہو گیا کہ یہ افسر ذمے داریوں کو سمجھنے والا ہے اور گاؤں میں آگ بجلی کے تار کٹ کر فصل اور جھوپڑوں پر گر جانے کے سبب لگی جس نے فادر پراؤن کے بنگلے کو اس کے مکینوں کے ساتھ راکھ کر دیا۔

پھر بھی آدی واسی سنگھٹن کے بعض نیتاؤں کی شکایت پر تحصیلدار کو دھام پور سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا اور اس کی جگہ شڈیول ٹرائب سے تعلق رکھنے والے دوسرے افسر کا تقرر عمل میں لایا گیا۔

اخباروں میں خبر آ گئی کہ دھام پور میں آگ سے متاثر ہونے والوں کی باز آبادکاری کا کام جنگی پیمانے پر شروع کر دیا گیا۔

باب : ۱۰

میسور کے جنوبی اور کیرالا مدراس کے شمالی جنگلاتی خطے میں ایک غیر معروف جاگیر کوڈے پورم میں راج ماتا کے نام سے مشہور سندری راجما لنگپا پارلیمنٹ کی سیٹ مہیلاؤں کے لئے آرکشت ہونے اور اپنے انتخابی حلقے میں ایک زمانے سے دھرم کرم کرنے والی مہیلا کی حیثیت رکھنے کے سبب اپنا الیکشن بلا مقابلہ جیت کر متحدہ قومی محاذ کی ایک رکن کی طرح حکمراں پارٹی میں شامل ہوگئی تھی۔

جوانی ہی میں بیوہ ہو کر سر گھٹا لینے والی راج ماتا نے راجدھانی پہنچ کر باب کٹ ہیئر اسٹائیل اپنا لیا۔ عمر: بیالیس سال، قد پانچ فٹ آٹھ انچ، رنگ گہرا سانولا، جسم فربہی مائل، ناک نقشہ متوجہ کن، آواز بھاری پھنسی ہوئی۔

دہلی آتے ہی وہ ایودھیا میں شیلا نیاس کرنے والوں کی سیاست میں سرگرم ہوگئی۔ کوڈے پورم میں مندروں کی تعمیر، ان کی سرکشا، رنگ رنگوٹی، پوجا ارچنا، دان پرساد وغیرہ معاملات کا اسے خاصا تجربہ تھا۔ دھرم کرم کرنے والی دانی مہیلا وہ پہلے ہی مشہور تھی، یہاں کارکردگی دکھانے کا بڑا میدان سامنے تھا اس لیے رتھ یاتراؤں اور پد یاتراؤں میں حصہ لے کر اس نے شمالی بھارت میں خوب شہرت حاصل کر لی۔ منو دھرم وشو آندولن کے ایک بین الاقوامی جلسے میں موجود سیکڑوں بھاوکوں نے اس کے دھرم پریم اور بھکتی بھاو کی باتیں سنیں۔ انھیں سے پر بھاوت ہو کر خود آندولن کا پرمکھ انجیا کئی اس سے ملاقات کے لیے آیا۔

ڈاکٹر انجیا سری نواسن کئی دنیا بھر کے مذہبوں، فلسفوں اور تہذیبوں تاریخوں کے تقابلی مطالعات میں اپنی کتابوں اور بھارتیہ پراچین سنسکرتی کے وشو بھر میں پرسارن کے لیے معروف تھا۔ ایک کنڑ مہیلا کو دھرم اور راج کارن میں اتنے اونچے استھان پر دیکھ کر اس کا خوش ہونا فطری تھا جس کے اظہار کے لیے وہ سندری راجما سے ملنے کرناٹک بھون میں اس کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ کنڑ اکلا کے نمونوں سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں راجما نے اس کا استقبال کیا۔

''نمگے سواگتم اِڈے، آپ کا سواگت ہے کئی جی'' وہ مسکرا کر بولی۔

''تھینکیو'' کئی صوفے پر بیٹھ گیا۔ راجما نے ملازم کو اشارے سے پاس آنے کو کہا پھر کئی کی طرف متوجہ ہو گئی، ''کیا لیں گے آپ؟''

''آپ سے ملنا ہی میرے لیے بڑا بات ہے۔'' کئی نے کہا، ''دکشن کا کنڑ مہیلا نے کل کے فنکشن میں جو وچار پرکٹ کیا، اس سے مجھے بہت آشا بندھا کہ میرا مشن جنتا کو پربھاوِت کرے گا۔''

راجما نے نوکر کو کچھ لانے کے لئے کہا اور کئی کی طرف مڑ گئی۔

''میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔'' وہ بولی، ''ادھر ہماری جاگیر میں یہ کتابیں نہیں ملتیں کنتو بنگلور، مدراس اور انگلینڈ امریکا سے آپ کی کتابیں ہم نے منگائی ہیں۔''

''اِڈو کے ڑی نُن گے تُمبا سنتوشا آیتو'' کئی نے کہا، ''بہت کھشی ہُوا میں آپ کا اندولن میں رُچی دیکھ کر''

''کیونکہ آپ ستیہ دھرم کا پرچار کر رہے ہیں نا۔''

ستیہ دھرم کا پرچار کرنے والے انجیا کئی سے اس کی یہ پہلی ملاقات ہی کئی کے مشن کے لیے بھارت ورش اور وشو کے دوسرے دیشوں میں ہندو دھرم اور سنسکرتی کے پرچار کے لیے اپنا سب کچھ لگا دینے تک کے وعدے پر پہنچ گئی۔

منو دھرم آندولن کا صدر دفتر شکاگو میں تھا۔ کئی نے ویب سائٹ پر اپنی رپورٹ وہاں لاگ اِن کرا دی اس طرح راج ماتا سندری راجما ایک انٹرنیشنل فنڈ امینٹلسٹ کلین میں شامل

ہو گئی۔ جلد ہی اسے پتا چلا کہ کوڈے پورم دنیا کے نقشے میں ایک اہم نام بن گیا ہے کیونکہ پراچین ہندوسنسکرتی کے آثار تلاش کرنے والی بہت سی ٹیمیں یہاں کے مندروں میں تحقیقات میں مصروف نظر آنے لگی تھیں۔ آندولن کے یورپی امریکی بھکتوں نے تھیزم کی سائنسی اور فلسفیانہ تشہیر کے لیے دنیا کے قدیم مذاہب اور ہندودھرم میں مشابہت کی موجودگی پر انٹر تھیولوجکل سیمینار اس گاؤں میں برپا کیے تھے اور اس طرح مذہب کی پشت پناہی میں ملکی سیاست کا کاروبار ایک نامعلوم گاؤں کو ہر لمحہ ویب سائٹ پر موجود دکھا رہا تھا۔

راجما کا ایک پانو دہلی میں تو دوسرا اپنے گاؤں میں رہنے لگا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ دونوں مقامات پر بیک وقت موجود رہتی۔ آوازوں اور لفظوں کے اسی الیکٹرونک لین دین میں ایک بار سوامی پرمانند کرپالو جی مہاراج سے اور لہروں کے خلط ملط ہو جانے کے سبب کئی بار فرینک اوہارا سے بھی لفظوں اور تصویروں میں اس کی ملاقاتیں رہیں۔

آتمک کڑوں کو الیکٹرونک لہروں میں بدل کر سوامی اور راجما کا افلاطونی وصال تو ہو چکا تھا، اب دونوں شاریرک ستر پر ملن کے لیے بھی ویاکل تھے۔ اس کے لیے راجما ایک چارٹرڈ ہیلی کاپٹر سے اورنگ آباد پہنچی اور وہاں سے اپنی پارٹی کے اہم کاریہ کرتاؤں کے ساتھ پاس کے گاؤں تلجا نگر، جہاں ایک ہرے بھرے شانت واتاورن میں سوامی کا آدھیاتمک آشرم بسا ہوا تھا۔

ستمالا کے پہاڑی سلسلے میں کنڑ گھاٹ کی ہزاروں فٹ چڑھائی ختم ہوتے یا اتار شروع ہوتے ہی اورنگ آباد روڈ پر پی ڈبلیو ڈی گوڈاؤن کے سامنے سوامی پرمانند مہاراج کے آشرم کا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر اکثر تازہ پھولوں کی مالا چڑھی رہتی ہے۔ اسی جگہ سے ایک کچا راستہ تلجا نگر کی طرف مڑتا ہے جو پہاڑی اونچائی پر تعمیر کیے گئے بھوانی ڈیم اور ڈیم کے باغاتی علاقے سے لگا ہوا ہے۔ یہ سوامی کے آشرم کا سرسبز علاقہ ہے۔ اونچے اونچے گھنے درختوں اور اونچی چہار دیواری میں چھپا ہوا بہت سی پھوس کے چھپروں والی جھونپڑیوں اور آر سی سی میں تعمیر کیے گئے سنسکرتی کامپلیکس کی جدید ترین عمارتوں کا میل۔

سوامی کے بھکتوں نے جو دنیا بھر میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے، آشرم کی

زمین خرید کر یہاں روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے قدیم وجدید سب ذرائع مہیا کر دیے تھے۔ آشرم میں ہمیشہ ملکی غیر ملکی بھکتوں کا میلہ سا لگا رہتا اور پوجا ارچنا کے سمّیلن چلتے رہتے۔

بجلی سے چلنے والے چہار دیواری کے گیٹ کو پار کرتے ہی گیروے رنگ کی دھوتیاں اور مالائیں پہنے کچھ سادھوؤں نے کاروں سے اترنے والوں کے گلوں میں سوامی کی تصویر والی مالائیں ڈال دیں۔ سب کو لال پیلا کالا ترنگی تلک لگایا۔ راجما اور اس کی سکریٹری کو پھولوں کے ہار بھی پہنائے۔ ایک نوجوان انجیا کٹی کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کچھ کہنے لگا۔

بات سن کر کٹی راجما کی طرف آیا اور جو کچھ اس سے کہا گیا تھا، راجما کو دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ سکریٹری کے ساتھ راجما کو کامپلیکس کے ایک خاص روم سے شیر ساگر میں اشنان کے لیے جانا تھا۔

کٹی اور ساتھ آئے ہوئے کاریہ کرتاؤں نے ایک اور خاص روم میں دیوار پر جڑے پردے پر وہ سب کچھ دیکھا جو کٹی کو سرگوشی میں کہا گیا تھا: راجما اور اس کی سکریٹری کو شیر ساگر میں اسنان کرتے ہوئے۔

سوامی پرمانند مہاراج نے آنتر درشٹی سے دیکھا کہ ساگر منتھن سے پرکٹ ہونے والی اپسرائیں دودھ کے جھاگ پر چلتی ہوئی کنارے آرہی ہیں۔ دوسری اپسراؤں نے ان کا سواگت کیا اور سنگ مرمر کی چوکیوں پر بٹھا کر نرمل جل سے ان کے شریر دھوئے۔ گہری سانولی توچا پر بہتی دودھ کی سفید دھاروں نے انھیں پتھر کی مورتیوں کا روپ دے دیا تھا۔ اسی حالت میں انھیں پاس کے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ان کے پہننے کے لیے گیروے رنگ کے وستر رکھے ہوئے تھے۔

سوامی کی نظر الیکٹرانک میڈیم میں بدل کر دیوار پر لگا ہوا پردہ بن گئی جس پر راجما اور اس کی سکریٹری پھولوں کے گہنے اور ہار پہنے ایک دروازے میں داخل ہو رہی تھیں جس سے گزر کر انھوں نے پردے پر نظر آنے والے منظر کو خالی کر دیا اور ساکشات سوامی کے سامنے پہنچ گئیں۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ لیے، آنکھیں موند لیں۔ انہیں دیکھ کر ستر سالہ بوڑھے کی آنتر

ناڑیوں میں لاوا بہنے لگا۔

سندری راجما کو یہاں آشرم میں ایسی بہت سی شکلیں نظر آئیں جنھیں وہ پارلیمنٹ میں بھی دیکھتی رہی تھی۔ کیا ستا پکش اور کیا وِپکش کے لوگ، سوامی جی کے شرن میں آکر سب ایک ہوگئے تھے۔ سب نے اپنے گلے میں مہاراج کی تصویر والی رودراکش مالا پہن رکھی تھی اور سب کی زبان پر ایک ہی نام تھا۔

آج کے خاص یکیہ کے بعد راجما کے ساتھ پلاسٹو موبائل کی مالکہ شوبھنا دیوی اور ممبئی ہائی کورٹ کی جج مایا سنگھ کو آشرم کی بھکتی ماتاؤں میں شامل کیا گیا۔ ان سے پہلے کی ماتاؤں نے اپنی خاص مالائیں اتار کر تینوں کے گلے میں پہنا دیں اور سوامی سے آشیرواد لے کر اسی وقت ملک اور غیر ملک میں مہاراج کے مشن کا پرچار کرنے نکل پڑیں۔

ان کی بدائی کے بعد سوامی نئی ماتاؤں کے ساتھ ایک ککش میں چلے گئے اور یکیہ بھون میں رہ گئے بہت سے بھکت اور بھکتنیاں۔

وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں رہ رہ کر دیوار پر لگے پردے کی طرف اٹھ جاتی تھیں لیکن پردہ خالی تھا، بہت دیر خالی رہا۔ اس عرصے میں بھکتوں نے آپس میں میل ملاپ بڑھایا۔ انجیا کئی کئی ایم پیز سے ملا۔ اس نے اپنی کتابیں سب کو تھمائیں اور اپنے آندولن میں شامل ہونے کی انھیں دعوت دی۔ جاپان، کوریا، فلیپائن وغیرہ ملکوں سے آئے ہوئے بھکتوں سے وہ دیر تک الجھا رہا۔ یورپی بھکتوں کو بھی اس نے قائل کرلیا، خاص طور پر فرینک اوہارا نامی بھکت سے وہ سر جوڑے بیٹھا جنم جنمانتر کے مسائل پر شبدوں کا جادو جگاتا رہا۔

بہت کچھ دے کر یا اس سے زیادہ بہت کچھ لے کر راجما آشرم سے واپس کوڈے پورم پہنچی تو انجیا کے علاوہ اوہارا بھی اس کے ساتھ آیا۔ کچھ خاص لوگوں کے ساتھ اپنے آبائی محل میں بیٹھ کر اس نے کٹی اور سوامی کے آندولن کے لیے بے حد مخصوص منصوبے تیار کیے۔ انھیں میں اوہارا اور کوڈے پورم کے جنگلوں کے باسی چندن چور راجپّن کے آدمیوں سے ملاقات بھی

شامل تھی۔

کولار روڈ پر میڈیکو (بنگلور) کیمیائی اشیاء اور ادویات کا بڑا پلانٹ تھا اور اس کی ملکیت سندری راجما کے بھائی سندری دیوی ناتھن کے نام تھی۔ اوہارا نے اس پلانٹ کا بھی دورہ کیا۔ دیوی ناتھن سے اس کی ملاقات میں کسی امریکی کمپنی کی ایک پیٹنٹ دوا یہاں تیار کر کے غریب ملکوں میں سپلائی کرنے کا معاہدہ طے ہو گیا۔

اوہارا کے اس کامیاب دورے اور غریبوں کو کم قیمت پر امریکی دوا حاصل ہونے کے مشن کی راجما کے ہاتھوں تکمیل کا جشن کوڈے پورم کے محل میں منایا گیا۔ دکن کی چاروں دراوڑ ریاستوں سے بھاجپا اور اس سے الحاق رکھنے والی پارٹیوں کے نیتا اس جشن میں شرکت کے لیے آئے اور لوک سبھا اسپیکر کی آمد سے تو یہ جشن کو قریبی پارلیمانی الیکشن میں قومی محاذ کی کامیابی کے لیے منصوبہ بندی کا وِراٹ سمیلن بنا دیا۔

دکن کی آدی واسی آبادی، ہندی انگریزی اور کنڑ اُردو کا جھگڑا، کرشنا اور کاویری کے پانی کی غلط صحیح تقسیم کی سیاسی اہمیت، ایودھیا: الیکشن کا ایک مدا، سنگھ پریوار کا آپسی مت بھید، رتھ یاترا، گئو ہتھیا پر پابندی، آتنگ واد، کشمیر گجرات اسرائیل پاکستان، بنگلا دیشی گھس پیٹھیے، تاڈا پوٹا موکا، تہلکہ ڈاٹ کام، پرسنل لاء سمان ناگرک، دھارا 356، شدھی کرن، بھارتیہ کرن ہندتو کو ایک دن پورے وشو کا دھرم بنانا ہے۔

کمپنی میڈیکو کا معائنہ کر گئی تھی۔ واپس جاتے ہی اس نے امریکہ سے اپنے فارمولے، اپنی دوائیں اور اپنے لوگ میڈیکو پلانٹ کی طرف روانہ کر دیے تھے۔ دواؤں کی پہلی کھیپ میں امریکی حکومت کا تحفہ بھارت کے اسکولی بچوں کو وٹامن کی مفت گولیوں کی صورت میں ملا۔ دیوی ناتھن نے کچھ ایسی ہی گولیاں اپنے یہاں تیار کر رکھی تھیں۔ امریکی گولیوں کے ساتھ انہیں بھی راجیہ کے آدی واسی علاقوں کی پرائمری اسکولوں میں مفت تقسیم کے لیے بھیج دیا گیا۔ ایک دن گولیاں صبح صبح بانٹی گئیں اور راجیہ کے بہت سے علاقوں میں شام کے اخباروں نے یہ

خبر جلی حروف میں چھاپی کہ ان گولیوں کو کھا کر سیکڑوں بچے موت کے منہ میں پہنچ گئے۔

راجما اس وقت مہیلا آرکشن بل کے متعلق پارلیمنٹ کے بعض ممبروں سے اہم ملاقاتوں میں مصروف تھی۔ بنگلور سے دیوی ناتھن کی گرفتاری کی خبر اس تک پہنچی تب وہ انجیا کئی اور تبت کے دلائی لاما اور پوری کے شنکراچاریہ کے ساتھ دہلی کے برلا آڈیٹوریم میں دھارمک مت بھید پر لکھی گئی ایک کتاب کے وموچن سماروہ میں بھاشن دے رہی تھی۔

تالیوں کی گونج میں جب وہ اپنی کرسی پر واپس آئی تو پاس ہی بیٹھی اس کی سکریٹری نے (قارئین اسے بھولے نہ ہوں گے) خبر کے الفاظ دھیرے دھیرے اس کے کان میں پہنچا دیے۔ بھاشن کی تکان سے پسینہ پسینہ راجما نے یہ الفاظ کچھ سنے، کچھ نہ سنے لیکن بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اسے دل اپنے کانوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے کٹی کو ڈائس کی طرف جاتے دیکھا اور چاہا کہ اسے کسی طرح روک کر واپس چلنے کے لیے کہے لیکن منچ پر انتر راشٹریہ دھارمک ہستیاں موجود تھیں، دھرم پر اُن کے وچار سنے بغیر منچ سے اتر جانا کسی طرح ممکن (مناسب) نہ تھا۔

اس عرصے میں ادھر دیوی ناتھن کی ڈرگ فیکٹری پر چھاپا پڑ چکا اور تمام نئی پرانی دواؤں کے اسٹاک پر پولس نے قبضہ کر لیا تھا۔

سیکریٹری نے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی، کرناٹک بھون سے ای میل بھیجا گیا اور ریاستی وزیر صحت سے بھی رابطہ قائم کر لیا گیا لیکن......

عوام نے اسکولوں اور دواخانوں پر دھاوا بول دیا۔ جگہ جگہ پولس سے مڈبھیڑ کے واقعات بھی ہوئے اور جب حالات پر کسی طرح قابو پایا گیا تو سرسری تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ مدرّسوں نے گولیوں کو صحیح طور سے اسٹاک کرنے میں بے پروائی کی تھی، اس میں ڈرگ فیکٹری والوں کا کوئی قصور نہیں۔

کئی مدرسین اور تعلیمات کے افسران معطل کر دیے گئے اس لیے ان کی یونینیں احتجاج اور ہڑتالوں پر اتر آئیں۔ اب جگہ جگہ خواص اور پولس میں تصادم ہوا اور جب حالات پر کسی

طرح قابو پایا گیا تو قابو ہی پالیا گیا۔

میڈیکو والوں نے واپس ملنے والا سارا اسٹاک نئے فارمولوں میں بدل کر نئی دوائیں نئے ناموں سے تیار کرڈالیں۔ دیوی ناتھن کا دامن صاف ہوگیا۔ ادھر دہلی میں راجما نے مرکزی وزیر صحت کے انڈر سیکریٹری کی کارکردگی سے خوش ہوکر اوبیرائے کے لان پر ایک گرینڈ پارٹی کا آیوجن کیا۔

ہندو دھرم کے کچھ یورپی اسکالر بھی اس پارٹی میں شریک تھے اور کٹی ان لوگوں میں خاصا مصروف تھا۔ انڈر سیکریٹری کو جلدی تھی کہ کٹی اس سے کہیں تنہا ملاقات کرلے، پھر ملتا رہے مہمانوں سے۔ وہ اس جگہ زیادہ دیر اپنا دکھائی دینا مناسب نہ سمجھ رہا تھا چنانچہ بھاگ دوڑ کراس نے کٹی کو گھیر ہی لیا۔

''راج ماتا خود آپ سے ملنا چاہتی ہیں'' کٹی نے مسکرا کر اسے بتایا اور راجما سے ملانے اسے لیتا گیا جو ننھے منھے قمقموں سے بھری جھاڑیوں کے ایک نیم تاریک کنج میں سرکار کے نمائندے سے باتوں میں مصروف تھی۔ کٹی جب قریب آیا تو مسکرا کر راجما نے دونوں کا استقبال کیا اور سیکریٹری سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

''ہم آپ کے آبھاری رہیں گے۔'' اس نے کہا اور دوسرا ہاتھ بھی سیکریٹری کے ہاتھ پر رکھ دیا، ''آپ نے بڑا...... بہت بڑا کام کیا۔''

''میڈم'' سیکریٹری ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا، ''میڈم، ہم تو سیوا کے لیے ہی بنے ہیں۔''

''کٹی جی'' وہ کٹی سے بولی، ''ہم ذرا سنگھ جی سے بات کر رہے ہیں، آپ صاحب کو سی آف کر دیجیے، پلیز''

''آیئے شریمان'' کٹی نے سیکریٹری کے سامنے ذرا جھک کر کہا، ''ہم میڈم کی سیکریٹری سے بھینٹ کرتے چلتے ہیں۔''

''ضرور، ضرور چلیے''

دونوں وہاں سے ہٹ کر ہوٹل کے ایک خاص کمرے کی طرف چل پڑے جہاں نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سوٹ کیس......

دروازہ بند کر کے ابھی وہ پلٹی ہی تھی کہ دستک ہوئی۔ اس نے ویو گلاس سے جھانکا تو کٹی کا چہرہ نظر آیا۔ اسے لگا کہ کٹی میری ہی آنکھ میں دیکھ رہا ہے، دروازہ کھلنے پر وہ مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

''کیا وہ خوش ہو کر گیا؟''

''کیوں نہیں'' کٹی نے پیچھے دروازہ بند کیا، ''اس کے کام سے زیادہ ایکسچینج دیا ہم نے اس کو۔''

''کچھ خاص زیادہ نہیں۔''

اندر آتے ہی کٹی پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔

''یہ دِچتر آدمی میرے جیون میں کیسے آملا؟'' راجما نے کٹی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، ''دھرم کو گھول کر پی رکھا ہے اس نے کتنو ابھی کچھ اور پی کر کتے کی طرح میرا انگ چاٹے گا'' یہ سوچتے ہوئے ایک لہری اس کے شریر میں دوڑ گئی۔ ''اب یہ میری ضرورت بھی تو بن گیا ہے، کیسے لال لال آنکھوں سے گھور رہا ہے''

تبھی کٹی نے اس طرح ہاتھ بڑھایا گویا چاہتا ہو کہ راجما اسے تھام لے اور...... اور اس نے راجما کو اپنی طرف کھینچا۔

یورپ اور امریکہ سے آئے ہوئے بہت سے بوڑھے جوان اسکالر سوامی پرمانند کے آشرم پہنچے تو کوڈے پورم جاتے ہوئے راجما بھی ان کے ساتھ یہاں تک چلی آئی۔ آشرم کی دوسری ماتائیں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ آدھیا تمک سادھ، یگیہ، پری کرما، پوجا ارچنا، بھجن پرساد، شیر ساگر میں اسنان اور پردے پر چلتی تصویریں۔

سوامی نے ہر بھکت سے ایکانت میں بھینٹ کی اور وشیش پرساد سے ہر ایک نے اپنی آنتر درشٹی سے سوامی کو اور اپنے آپ کو نہارا۔ پنچ مہا بھوت کی مایا کو پار کر کے وہ ایک ایسے اندھکار میں ولین ہو گئی جسے انت نراکار کہنا چاہیے۔ اسے لگا کہ میں یگ یگ سے اس نراکار کا

انش ہوں، اگر چہ ایک جانی پہچانی مہک اپنے استتو سے اسے یاد دلا رہی تھی کہ میں کچھ ہوں، میں کہیں ہوں، میں نرا کار نہیں ہوں۔

راجما کے محل پہنچ جانے کی خبر سن کر بھی اوہارا اور راجنن کے آدمیوں نے اپنی معاملت جاری رکھی۔ میلی خاکی وردی میں یہ دو لمبے دبلے سیاہ فام اوہارا کے ساتھ میز پر پھیلے کاغذات کو اِدھر اُدھر کرتے اور کبھی کبھی ان پر کچھ لکھتے اور نشان لگاتے رہے۔ دیوی ناتھن کئی بار انہیں جھانک گیا بلکہ راجما کی آمد کی خبر بھی اسی نے اوہارا تک پہنچائی لیکن ایک بار سر اٹھا کر دیکھنے کے سوا اس نے کوئی بات نہ کی اور کاغذات پر جھکا رہا۔

یہ بات راجما کو بتانی ضروری سمجھ کر دیوی ناتھن بہن کے خاص کمرے میں آیا۔

اس کی ساری بات سن کر راجما نے فون پر میٹنگ ہال کا نمبر ملایا۔ کئی بار رنگ کے بعد ادھر سے جواب آیا، ''ہیلو، یہ میں ہوں'

''مسٹر اوہارا'' راجما نے خوش دلی سے کہا، ''آپ کی میٹنگ ......''

''بس ختم ہی سمجھو'' جواب ملا، ''پیپر بدل لیے گئے ہیں اور جنگل کے باسی واپسی کے لیے تیار ہیں۔''

''ٹھیک ہے، کیا آپ مجھ سے ملنا پسند کریں گے؟''

راجما کا یہ سوال دیوی ناتھن کو عجیب سا لگا۔ فون سے جواب کی آواز بھی اس نے سنی لیکن الفاظ سمجھ میں نہ آئے۔ راجما فون رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

''تم نے اسٹاک کا کیا کیا؟''

''بدل دیا'' دیوی ناتھن بولا، ''اور بہت سا کاویری میں بہا دینا پڑا۔ کیا یہ لوگ یہاں رکنے والے ہیں؟''

''تمہارا مطلب ہے، وردی والے؟'' راجما نے پوچھا۔

''ہاں وہی'' دیوی ناتھن نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ دیواروں دروازوں کے بیچ نہیں رہتے۔''

تبھی فون بج اٹھا۔

''ہیلو'' دیوی ناتھن نے فون اٹھا کر کہا اور ادھر سے کچھ سن کر فون راجما کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ دیر باتیں سنتی اور سر ہلا کر ہوں ہاں کرتی رہی پھر فون رکھ کر دیوی ناتھن سے بولی، ''اوہارا میڈ یکو امریکہ کے پیپرز پر تمہاری سائن چاہتا ہے، اس نے گولیوں کے سارے اسٹاک کا حساب پھر سے بنا لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں سائن کر دیتا ہوں۔''

''اور کل تم اس کے ساتھ سری رنگم اسٹیٹ تک چلے جاؤ۔''

''وہاں تو وہ ان وردی والوں کے ساتھ بھی جا سکتا ہے۔''

''وردی والے کسی اجنبی کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔''

''اب کیا وہ بڑے وردی والے سے ملنا چاہتا ہے؟''

''وہ جانے'' راجما بولی، ''ہمارا کام اسے اسٹیٹ تک پہنچانا ہے اور بس۔''

''میرا ساتھ جانا کیا ضروری ہے؟'' دیوی ناتھن نے پوچھا، ''وہاں تک تو ہمارا کوئی بھی آدمی اس کے ساتھ جا سکتا ہے''

''تم بنگلور تو جا ہی رہے ہو نا'' راجما نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، ''راستے میں اسے ڈراپ کر دو''

دیوی ناتھن کچھ سوچنے لگا۔

اوہارا نے یہاں کوڈے پورم محل میں بیٹھ کر نہ صرف راجپن سے اپنے معاملات طے کئے بلکہ دکن کے بعض غیر معروف مندروں سے قدیم مورتیاں اور زیورات، کئی نایاب قلمی کتابیں یہاں تک کہ روحوں کو حاضرات میں بلانے والے بہت سے ٹوٹکے بھی موریشس کے راستے مغربی ملکوں میں پہنچانے کے سودے کر ڈالے تھے۔ ان میں ایک قریبی جزیرے پر لڑی جانے والی تمل آزادی کی جنگ کے لئے جدید ترین ہتھیاروں کی سپلائی کا سودا بھی شامل تھا جس کی کاغذی کاروائی کے لئے اب وہ سری رنگم اسٹیٹ کے کے جنگلوں سے ساحل مدراس کی طرف سندری دیوی ناتھن کے ساتھ نکل پڑا تھا۔

کوڈے پورم سے پچاس کلومیٹر مشرق میں میسور بنگلور روڈ پر لگے سری رنگم اسٹیٹ بورڈ کے آگے بھارت کے مشرقی ساحل تک گھنے جنگلوں کا علاقہ پھیلا ہوا ہے دیوی ناتھن کو اتنا کرنا تھا کہ روڈ سے اتر کر کچے راستے پر دو کلومیٹر گاڑی لے جاتا اور اسٹیٹ کا ایک اور بورڈ نظر آنے پر اپنے امریکی مہمان کو الوداع کہہ دیتا۔

فرینک اوہارا مشرقی ساحل کے کسی خاص حصے میں کی جانے والی آ کری کاروائی کو ذہن میں ترتیب دے رہا تھا: کسی سے ملنا ہے، کیا کرنا ہے، کیا لینا دینا ہے؟ یہ ساری باتیں بآواز بلند اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں کہ کار روک دی گئی۔ غیر ارادی طور پر وہ چونک پڑا اور جب دیوی ناتھن گھنی جھاڑیوں میں آدھے لٹکے ہوئے اسٹیٹ کے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے اوہارا سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ اسکے دھچکا کھائے ہوئے دماغ کی گہرائی سے ایک خیال اچھل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے دیوی ناتھن کو بھی کار سے اترنے کے لئے کہا۔ جب وہ باہر آیا تو اوہارا نے اس کے کندھے پر دوستانہ ہاتھ رکھ کر اس کے علاقے کے متعلق کچھ سوالات کئے اور جواب سن کر۔

رات گئے بھی جب دیوی ناتھن کے بنگلور پہنچنے کی خبر نہ آئی تو سندری وسندھرا، اس کی بیوی کو تشویش ہونے لگی۔ اس نے راجما کو محل میں اس کے آفس فون لگا کر اپنے شوہر کے متعلق دریافت کیا۔

''کسی کام میں الجھ گیا ہوگا'' راجما نے جواب دیا۔

''لیکن وہ فیکٹری پہنچتے ہی مجھے خبر کر دیتے ہیں''

''کر دے گا، کر دے گا'' ادھر سے کہا گیا، ''دن نکلتے کر دے گا''

اتنی بات کے بعد وسندھرا نے فون کٹنے کی آواز سنی۔ اس نے بھی فون رکھ دیا اور ماتھے پر آیا پسینہ پوچھنے لگی۔ کچھ دیر بعد بنگلور فون کرنے پر فیکٹری سے کسی نے بتایا کہ صاحب تو ادھر آیا ہی نہیں۔

اب اس کی الجھن کا بڑھنا فطری تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آنے

لگے۔ میڈیکوں کی گولیوں سے بچوں کی موت اور بعد کے واقعات: عوام کی ہڑتالیں، جلسے جلوس، گھیراؤ، شور شرابا، مار پیٹ۔

ساری رات اس نے بستر میں کروٹیں بدلتے اور اٹھ اٹھ کر کمرے میں ٹہل کر کاٹی۔ دن نکلتے بھی دیوی ناتھن کا فون آیا نہ اس کے متعلق کوئی خبر سنائی دی۔ پھر کوڈے پورم سے بنگلور، کولار، میسور، چینئی اور دوسرے کئی مقامات پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی الیکٹرونک آلات پر کی گئی بات چیت نے ہفتے بھر میں ایک اخباری خبر

میڈیکو (بنگلور) کے مالک شری سندری دیوی ناتھن اغوا کر لیے گئے۔

کا روپ دھارن کر لیا۔ اس خبر کے تین دن بعد راجما نے خاص اپنے آفس میں ایک آڈیو کیسٹ میز پر پڑا ہوا پایا، اس پرچی کے ساتھ کہ ''اِدنو تکشنا کیلیہ'' یعنی اسے فوراً سن لیا جائے۔

اس ٹیپ میں چندن چور راجپّن نے اپنی آواز میں اعتراف کیا تھا کہ دیوی ناتھن میرا مہمان ہے اور کچھ دنوں بعد اسے بنگلور بھیج دیا جائے گا۔

باب : ۱۱

کارپوریشن کے میٹنگ ہال سے باہر نکلتے ہوئے ساونت نے پشپا کو کمشنر آفس پر پہنچنے کی تاکید کی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر صدر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے تاکہ وہاں دھرنے پر بیٹھے ہوئے چوتھے درجے کے میونسپل کرمچاریوں کا حال چال معلوم کرے۔

راہداری میں اتنا ہجوم تھا کہ اسے پار کر کے جلد سے جلد باہر آنا پشپا کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ میں لوگوں میں گھری ہوئی ہوں یا ساتھ چلنے والوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ دو چار جانی پہچانی صورتیں اسے نظر آئیں تو انھیں دیکھ کر وہ رسماً مسکرائی بھی لیکن جلد ہی یہ صورتیں گم ہو گئیں اور اسے لگا کہ باہر نکلنے سے مجھے روکا جا رہا ہے یا کسی اور طرف لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اب اس کے آس پاس دس بیس انجانے جسموں کا ہجوم تھا اور وہ واقعی اسے کسی دوسری جانب ہانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ انھیں میں گھری گھری راہداری سے گزر گئی۔ تب پیچھے سے کسی نے دانتوں کے بیچ سے سرگوشی کی، ''اسیدھے چلتی رہ، گیٹ کی طرف جانے کی جرورت نئیں۔''

اس نے ادھر ادھر کسی اپنے کو تلاش کیا۔ اسے ساونت بھی یاد آیا۔ کیا کروں؟ کسی کو بلاؤں؟ یہ لوگ کون ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کئی سوالات اس کے ذہن میں کوند گئے۔ اس کے پانو سن سے ہو رہے تھے اور سر گھومنے پر تھا۔ ساتھ چلنے والوں کی رفتار اب خاصی تیز تھی اور وہ ان کے بیچ چلنے پر مجبور۔

''اسیئیچ چلتی رہ...... اسیئیچ...... ایک دم سمور...... سامنے''
اچانک کسی نے آگے بڑھ کر سامنے کھڑی ایک کالی میٹا ڈور کا دروازہ کھولا اور پیچھے آنے والوں نے اسے گاڑی میں ڈھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

دیے گئے وقت پر جب وہ کمشنر آفس نہ آئی تو ساونت کو الجھن ہونے لگی۔
''ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا'' اس نے سوچا، ''کمشنر نے کتنی مشکل سے ملنے کا ٹائم دیا تھا اور یہ میڈم غائب ہے، دھرنے والوں کے ساتھ اتنا ٹائم پاس کر دیا......'' اس نے گھڑی دیکھی، ''کہاں نکل گئی یار، یہ عورت؟ اب کمشنر سے دوبارہ ٹائم ملیں گا کہ نئیں؟ یونین والے الگ جان کھائیں گے سالے، اگر یہ آ جاتی......'' اس نے جھولا کندھے سے لٹکایا اور دھرنے والوں کی طرف تیز تیز نکل پڑا۔ گیٹ پر ایک شامیانے کے نیچے کئی عورتیں مرد بیٹھے نظر آئے۔ کئی بورڈ ادھر ادھر کھڑے کر دیے گئے تھے جن پر یونینوں اور دھرنے والوں کے نام ان کی مانگوں کے ساتھ لکھے تھے اور لال پیلی جھنڈیاں، بینر اور شامیانے پر لگا بھونپو۔
ساونت نے یہاں پشپا کو تلاش کیا۔ کچھ لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا بھی۔
''میں سارا ٹائم ادرچ ہے، میڈم نئیں دکھی میں بولتا۔''
''کہاں نکل گئی یار، یہ عورت؟'' ساونت بڑبڑایا۔
''کوئی کھاس بات کیا موتھا بھاو؟''
''ارے یار کیا بولوں۔''
''ادر نکلتے نکلتے میرے کو دِکھی تھی۔'' وہاں موجود ایک شخص نے ساونت کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔
''کہاں رے، کِدر؟''
''میٹنگ کے بعد میڈم اِدرچ آنے والی تھی، میں نے ان کو چار نمبر گیٹ پر دیکھا تھا۔''
ساونت ادھر بھاگا۔
اب وہاں پارکنگ شیڈ خالی پڑا تھا۔

لکڑی کے تختوں کو جوڑ جوڑ کر کھڑے کیے گئے احاطے پر ٹن کا چھپر تھا اور سارے میں مچھلیوں کی بساندھ پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مچھلیوں کے ٹوکرے ایک پر ایک ڈھیر کیے پڑے اور چھپر کو سہارنے والے ستونوں سے جال بندھے یا لٹکے ہوئے تھے۔ اندر سے بند دروازے کے پاس ایک پرانی میز اور لوہے کی دو کرسیاں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ کولیوں کا گوڈاؤن ہے جہاں میں قید ہوں۔

سر پر ایک بلب لٹک رہا تھا، دھندلی پیلی روشنی والا اور چھپر مکڑیوں کے جالوں سے اٹا ہوا۔

گیلی زمین پر ٹوٹے پھوٹے بکسوں کے بیچ ایک لوہے کی کرسی پر وہ بیٹھی یا بٹھادی گئی تھی۔ اس کے پاؤں کرسی کے پایوں سے کس کر بندھے تھے۔ ہاتھوں کو پشت پر لے جا کر کرسی سے باندھا اور منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔

سارا واقعہ اس کے ذہن میں گھوم گیا: جب وہ میٹنگ ہال سے تماشے کے تمبو سے نکلی تو ایک میٹاڈور ایک ٹیکسی میں اسے زبردستی بٹھا کر دو کالے چھوکرے اس کے ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ پھر اندھیرے راستوں پر سفر گاڑی میں بیٹھے چھوکروں کی چھیڑ چھاڑ چیخ پکار گاڑی کے دھچکے یہ سب دن کی روشنی میں رات کے اندھیرے میں ہوا۔ اسے ایک کھاٹ سے باندھ دیا گیا اس کے پاؤں کرسی کے پایوں سے کس کر بندھے تھے اور ہاتھوں کو پشت پر لے جا کر یہ راستے میں کوئی ڈھابا ہے مچھلی مار کولیوں کا گوڈاؤن چندو دوسری گاڑی سے آ رہا ہے ساونت کمشنر آفس میں ہے۔

اس کا سر گھومنے لگا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

فون دیر تک بجتا رہا اور کسی نے ریسیو نہ کیا تو ساونت کو الجھن ہونے لگی۔

''وہ گھر پر بھی نہیں'' اس نے سوچا، ''تو کہاں گئی؟ آج تو کہیں سبھا یا ریلی بھی نہیں ہے اور ہوتی بھی تو کیا وہ اکیلی جاتی؟'' سوچتے ہوئے ساونت نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور

کارپوریشن سے باہر آ کر جی پی او کی طرف چل پڑا، اس خیال سے کہ شاید پشپا اولڈ کسٹم ہاؤس کے کسی آفس میں مل جائے۔

ایک گھنٹے تک پہیوں پر دوڑنے کے بعد لوور پریل میں ایم جی روڈ پر ڈھولکیا مل کے سامنے اس نے اسکوٹر بنگلے کے آگے روکا جالی میں ہاتھ ڈال کر لوہے کا گیٹ کھولتے وقت کمپاؤنڈ میں کہیں بیٹھا ہوا کتا دوڑتا ہوا آیا اور ساونت کے اندر آتے آتے اس کے گرد گھوم کر کوں کوں کرنے لگا۔

اس نے ایک دوبار کتے کی پیٹھ سہلائی اور بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں اسے تالا نظر آیا۔

''حد ہوگئی یار، اس اَورت کی۔'' اس نے سوچا۔ پھر طرح طرح کے خیالات نے اسے آلیا، ''کہیں بھٹک تو نہیں گئی، گاڑی واڑی کی چپیٹ میں تو نہیں آ گئی؟ کڈنیپ تو نہیں کرلیا کسی نے ......'' یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی چابی سے تالا کھولا اور اندر آ کر روشنی کی۔ کئی جگہوں پر فون سے پتا کرنے کی جتن بھی اس نے کیے لیکن ہر جگہ اسے پشپا کے بے پتا ہونے ہی کی خبر ملی۔

''آج اگر یہ میڈم ٹائم پر کمشنر سے مل لیتی'' وہ سوچ رہا تھا، ''تو سالا ٹینڈروں کا مالا نپٹ جاتا۔''

ساونت نے مہانگر پری وہن منڈل کے کاموں کے لیے منگائے گئے بہت سے ٹینڈروں کو پشپا نگرکر کے دستخطوں سے پاس کرانے کے لیے کئی کمپنیوں سے بڑی بڑی رقمیں پہلے ہی وصول کرلی تھیں اور کمشنر سے ملاقات کے بعد ٹینڈروں کی منظوری سے وہ مزید کئی لاکھ حاصل کرسکتا تھا۔

''سالی کو اسی وکھت گائب ہونا تھا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''کمپنی والوں کے ساتھ منڈل کی یونین والے الگ میرا بھیجا کھائیں گے۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ہیلو'' نمبر ملانے کے بعد وہ بولا، ''می ساونت، میڈم اُدر آفس میں ہے کیا؟''

لیکن یہاں بھی اسے پشپا کے بے پتا ہونے کی خبر ملی۔

پردے پر فلم آرٹسٹ ارملا خان کے شدھی کرن کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہون کے گرد بہت سے سادھوگن منتروں کا جاپ اور وقفے وقفے سے ہون میں بھڑکتے اگنی دیو کو ارچنا سامگری بھینٹ کر رہے تھے۔ پس منظر میں سوامی پر مانند اور ارملا خان ہون کی طرف آتے ہوئے۔

سوامی نے پاس آ کر ارملا کو سادھوؤں کے بیچ کھڑا کر کے خود بھی منتر پڑھے۔ اس کے سر پر کئی چیزیں وار کر انہیں ہون میں جھونکا اور یکلخت پردے کا منظر غائب ہو گیا۔ وہاں بیٹھے گیروے کرتے والے لڑکے نے ویڈیو پلیئر کے ایک دو بٹن دبائے اور پردے کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی سے اس طرف جھانکنے لگا۔ شدھی کرن کی وِدھی چل رہی تھی۔ سادھو اور سوامی ارملا کو گھیرے شیر ساگر کی طرف جا رہے تھے۔

ودھی سماپتی کے بعد سوامی اور ارملا دوسری اپسراؤں کے ساتھ شیر ساگر میں اسنان کر رہے تھے کہ کنارے پر رکھی ایک تپائی سے خصوصی فون کا بزر بجنے لگا۔ اس فون کو صرف سوامی ہی ریسیو کر سکتا تھا اس لیے اپنی پرا کرتِک اَوستھا میں اسے سوئمنگ پول سے باہر آنا پڑا۔

''ہاں، ہم ہی بول رہے ہیں۔'' کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

''سوامی جی، ادھر آپ کا نام آپ کے ایک امریکی بھکت کے ساتھ میڈیا میں خوب چل رہا ہے۔''

''او ہارا؟''

''جی ہاں، اس نے جافنا میں چل رہے ایک پریاس میں ایم پی سندری راجما کے ساتھ آپ کا بھی نام اخباروں کو بتا دیا ہے۔''

''وہ کھُد کہاں ہے؟''

''اس معاملے میں سی بی آئی والے اس سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں اور وہ اپنے امبیسیڈر کو بیچ میں لا کر واپس اڑ جانا چاہتا ہے۔''

''سندری راجما سے تم نے بات کی؟''

''وہ اپنے بھائی کے لیے پریشان ہے اس لیے آپ اس کے مال کی ڈلیوری اُدھر کے

کسی گھاٹ میں روک لیجیے، ورنہ آپ جانتے ہیں کل لوک سبھا میں جو ہنگامہ ہوا ایک کتاب کو لے کر، اس سے آپ کے آشرم میں آنے والے ایم پیز کی پوزیشن خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''تم سی بی آئی کے کسی آدمی سے ہماری بات کراؤ۔''

''سوامی جی، اب بہت دیر ہو چکی ہے، اچھا ہو گا آپ بھی اپنے سکم والے آشرم کی اور نکل جائیں۔''

گیروے کرتے والے لڑکے نے ایک بار پھر ویڈیو پلییئر کے بٹنوں کو دبا کر پردے کی طرف دیکھا: ایک ننگ دھڑنگ بوڑھا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ پس منظر میں شیر ساگر میں نہاتی اپسرائیں۔

راجما کو اب کی بار ایک ویڈیو کیسٹ اس پرچی کے ساتھ ملا کہ اسے دیکھے بغیر سی ایم تک فوراً پہنچاؤ۔

دیوی ناتھن کے اغوا کے بعد سے دنیا بھر کے اخبارچی کوڈے یورم، بنگلور، چینئی اور دکن کے بعض دوسرے مقامات پر اپنے کیمرے، ٹیپ ریکارڈرز اور نوٹ بکیں لیے بھاگ دوڑ میں مصروف نظر آنے گلے تھے۔ راجما کو ہر وقت وہ گھیرے رہتے۔ اس کی کسی بات سے سراغ پا کر وہ سی ایم تک بھی جا پہنچے۔

''ہم نے راجپّن کا ویڈیو دیکھا ہے، اس کا دیوی ناتھن سے کوئی تعلق نہیں۔'' سی ایم نے بیان دیا۔

اسی زمانے میں شام کے ایک اخبار نے چینئی سے خبر دی کہ تاملناڈو کے سی ایم کو بھی ایک ویڈیو کیسٹ راجپّن کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

راجما او ہارا کے غائب ہو جانے سے بھی پریشان تھی۔ پھر سوامی پرمانند کی طرف سے جواب میں خاموشی ہی کا پیغام آ رہا تھا۔ کئی وشو آندولن کے ایک جلسے کے لیے شکاگو جا چکا تھا اور راجما پر کیا بیت رہی تھی، اس کی پروا کیے بغیر شکاگو آ جانے پر اس سے اصرار کر رہا تھا۔

''کیا اوہارا بھی وہاں تمہارے ساتھ ہے؟''

''نہیں، وہ اِدر نہیں ہے، اس کے بارے میں نیوز آرہا ہے کہ لنڈن میں کھالستان کے پریسی ڈینٹ سے اس کا کوئی پرابلم چل رہا ہے، بھگوان جانے۔''

''تم کو مالوم، دیوی ناتھن اسی کے ساتھ تھا۔'' راجمانے بتایا،''اور تبھی راچپن اسے اٹھا لے گیا اور اب اِدر ساؤتھ کے پورے ایریا میں اس کا ٹیرر پھیلا ہے۔''

''پارٹی کو بولو'' کئی نے اسے مشورہ دیا،''اس پرابلم میں وہ مدد کرے گا۔ئیں تو سی ایم سے بات کرو، وہ کیا بولتا، پھر میں دیکھیں گا۔''

وہ فون رکھ کر ہٹ رہی تھی کہ پھر گھنٹی بجی۔

''لو'' دوسری طرف سے کسی نے کہا،''دیوی ناتھن سے بات کرو''

سوامی پرمانند کے آشرم میں اوہارا اور کئی نے دھارمک وچاروں کے آدان پردان پر بہت سے معاملات طے کیے تھے۔ منودھرم وشوآندولن کے لٹریچر کو سارے وشو میں پھیلانے کے لیے اوہارا نے حامی بھرلی تھی اور آشرم سے کوڈے پورم آ کر وہ راچپن کے آدمیوں کے سامنے دکشن کے تمل باغیوں کا بھلا کرنے پر آمادگی ظاہر کرچکا تھا۔ اس نے آندھرا میں لڑی جارہی عوامی جنگ کے سورماؤں کو بھی ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ اس وقت کیا تھا جب دیوی ناتھن کے ساتھ وہ سری رنگم اسٹیٹ جارہا تھا (دیوی ناتھن کے اغوا کی خبر اسے لندن میں ملی تھی جب وہ خالصتان کے سابق صدر کی دی گئی ایک پارٹی میں ......)

جس وقت وہ لندن میں موجود تھا اسی وقت عرب بادشاہوں اور آمروں کے درباروں میں بھی وزیروں اور شہزادوں سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ جس وقت وہ مشرقی جزیروں میں آزادی کے متوالوں اور جمہوریت پسندوں کو قدامت اور مذہبیت کے خلاف ہتھیاروں سے مدد کا وعدہ کررہا تھا اسی وقت جنوبی امریکہ اور افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والی پسماندہ پچھڑی دلت جاتیوں کو ان کی آبائی ٹوٹم روایتوں کا سبق دوبارہ پڑھنے پر اکسا رہا تھا۔ جس وقت وہ دہلی میں روی مہتا سے معاملہ کررہا تھا اسی وقت کھٹمنڈو کے ماؤوادی گوپا سنگھ سے نیپالی

سرکار کے خلاف ایک پمفلٹ کا سودا بھی اس کے سامنے تھا۔ وہ اسرائیل میں تھا اور وہ بنگلہ دیش میں تھا۔ کابل کے بازاروں میں امریکی فلموں اور فیشنوں کا میلہ اس نے لگا دیا تھا تو کراچی میں آباد پٹھانوں کو مہاجرین کے علاقوں میں بم باری کی ترکیبیں وہ سمجھا رہا تھا، عراق میں حکومت کی نئی تشکیل کی فکر اسے کھائے جا رہی تھی اور شام اور ایران اور لیبیا اور ترکی وغیرہ حکومتوں کے تختے الٹ دینے کے منصوبے بھی اس کے ماسٹر کمپیوٹر میں موجود تھے۔ اس کے پیچھے دو جل پریاں تیر رہی تھیں اور وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر کیے گئے حملے سے سکتے میں آیا ہوا تھا۔

سابرمتی ندی کے کنارے سابرمتی گاؤں میں سابرمتی کے سنت کا آشرم ہے۔ سابرمتی ریلوے اسٹیشن پر کھڑی سابرمتی ایکسپریس کا ایک ڈبا سابرمتی کے رام بھکتوں سے بھرا ہوا تھا، سب کے ہاتھوں میں کھڑک اور ڈھال، سابرمتی کے سنت، تو نے کر دیا کمال۔

لیکن یہ بہت بعد کی گھٹنا ہے۔ اس کے پہلے مہتا اور پنڈیا اور ان کے سہکاری شانتی یاترا میں ایک گائے کے دھکے سے گر کر زخمی ہو جانے والے رام اوتار پانڈے جی باپو کی عیادت کے لیے امباواڑی کے آدھیاتمک کیندر جاتے آتے اور گھیلیا کی باڑی سے ملاقاتیں کرتے رہے۔

پروفیسر اوما چوہان کے سامنے بہت سے پرانے ہندی انگریزی اخبارات پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کسی کے پہلے پنے پر تو کسی کے بیچ والے یا آخری پنے پر بعض کالموں کے گرد لال نیلی لکیروں سے چوکھٹے بنے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ خبروں اور تصویروں کے تراشے بھی تھے جن میں لوک کلاکار موہنی ہر داس کے پروگراموں کے اعلانات، رپورٹیں اور تبصرے اوما نے بڑی دلچسپی سے پڑھے۔ جب اس نے اخباروں کی تاریخیں دیکھیں تو پتا چلا کہ صرف دس سال پہلے یہ ناٹک کھیلا گیا تھا جس میں انٹرنیشنل فگر بن جانے والی موہنی

اس نے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی بوڑھی ہو گئی موہنی پر ایک نظر ڈالی اور سوچا کہ یہ ناری کے شوشن کی سچی تصویر ہے۔ ابھی کل کے اخباروں میں اس نے راجا دیورائے سنگھ کے لوک سبھا میں دھارا 356 کو لے کر دیے گئے زوردار بھاشن پر ہونے والے ہنگامے کی خبریں پڑھی اور تصویریں دیکھی تھیں۔

''ایک کیریکٹر'' اس نے سوچا، ''کسی طرح ایک کہانی سے نکل کر دوسری کہانی میں پارٹ کرنے لگا اور دوسرا'' سوچتے ہوئے اس نے موہنی کی طرف دیکھا، ''جلتے ہوئے ریگستان میں اپنے استو کو کھپا دینے والی ندی بن گیا۔''

نیپالی سرحد کے قریب دشوار گزار جنگلوں پہاڑوں میں آباد اس چھوٹی سی بستی میں ایک پگوڈا نما مندر یا مندر نما پگوڈا ہے جسے بستی کے بدھ دھرمی گوتمی دیوی کا اور ہندو لکشمی دیوی کا آسن کہتے ہیں۔ اس آسن کے وشال دھرم شالا میں سادھو رام داس لاہری اپنے ٹولے کے سادھوؤں سادھویوں کے ساتھ ڈیرا جمائے ہوئے تھا۔

یہیں اسے کسی طرح خبر ملی کہ وپکش کی نیتا کے خلاف پھر سے آندولن چل پڑا ہے اور اب تو خود اس نیتا کے پیچھے چلنے والوں میں کچھ لوگ اس کے بھارتیہ مول سے نہ ہونے پر اعتراض کر رہے ہیں۔

''جے میّا'' کہہ کر لاہری نے چلم کا لمبا کش مارا اور کھڑا ہو گیا۔ وہاں گھیرا ڈالے دوسرے سادھو سادھویاں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''چلو، اٹھو مہاتماؤ'' وہ بولا، ''ہم واپس دلّی جا رہے ہیں۔''

اُپنیاس کار آلوچک شری کانت دوبے کو آج کی خبر نے سخت حیرت میں ڈال دیا کہ ستنام کی کہانی ''تخت اور تختہ'' کا حقیقی مہندر سنگھ اور اس کے اپنے فکشن ورک کا فرضی راجندر سنگھ عرف بھیا جی بہت سے سرکاری اور بہت سے غیر سرکاری مقدمات جیت کر باعزت بری ہو گیا ہے۔

دوبے نے راج کارن اور سماج کو ایک بدبودار گالی نذر کرتے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ہیلو'' ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد وہ بولا، ''شریمتی میرا یادو؟''

''جی ہاں، بول رہی ہوں'' ایک نندا سی آواز سنائی دی۔

''میں دوبے'' اس نے کہا، ''شری کانت دوبے''

''اوہو، شریمان جی! کہیے، کیوں کشٹ کیا؟''

''یار میرا'' دوبے بے تکلف ہوگیا، ''آج ایک نیوز دیکھ کر مجھے کلکتہ والا فکشن سیمینار یاد آ گیا۔ اس کے تعلق سے تم نے بھی ضرور کچھ لکھا ہوگا۔ ہمارے اس کام کی رپورٹ کب آ رہی ہے، کچھ پتا ہے تمھیں؟''

اس کام کی رپورٹ کا پتا ماہم (ممبئی) کے ایک پریس کلاسک پرنٹرز کو ہے یا دادر (ممبئی) کے ایک بیوپاری حکم چند ملکانی کو۔ اس کا پتا ماہم کی مارواڑی چال کے ایک کباڑیے کو ہے یا ماہم درگاہ روڈ پر رہنے والے اس بے نام فٹ پاتھیے حمال کو جس نے اس رپورٹ کی پچیس ہزار جلدیں۔

اس کام کی رپورٹ کا پتا شہری وکاس منتری وامن راو گھور پڑے عرف اپا کو بھی ہے جس کے اشارے پر اس رپورٹ کی ایک شخصیت پشپا نگر کر کو

دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں نے اس واقعے پر احتجاج کیا اور ہندوستان کے راشٹر پتی اور پردھان منتری کو خطوط لکھے اور فون کیے۔ حقوق انسانی کی دہائی دینے والوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

آگ اور خون کے اس ڈرامے سے گریسی براؤن کسی طرح زندہ بچ نکلی تھی۔

''میں نے خدا کی ان بھیڑوں کو معاف کر دیا ہے۔'' اس نے پریس والوں سے ایک بات چیت میں کہا، ''اور اس ملک کے قانون سے بھی مجھے امید ہے کہ بے انصافی نہ کرے گا۔''

کسی انجن کے پھٹپھٹانے کی آواز دیر تک وہ سنتی رہی۔ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا جس کی دھمک میں شاید اسے فون میں کسی کے بولنے کی آواز سنائی نہ دے رہی ہو۔

''ہیلو، ہیلو'' وہ پکاری۔

''میں'' ایک اجنبی سی آواز ''میں دیوی ناتھن بولتا اکا۔''

''دیوی'' وہ بے چین ہو اٹھی، ''دیوی تو کہاں ہے؟''

''میں بتا نہیں سکتا اکا'' وہی آواز، ''میں اور ایک لانچ میں ......''

راجما نے صاف محسوس کیا کہ بولنے والے کے ہاتھ سے فون لے لیا گیا ہے۔ انجن کے ساتھ ساتھ اسے اور کئی لوگوں کے بولنے چیخنے کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

''جنگل والے کا آرڈر ہے'' پھر کسی نے غرا کر کہا، ''ہم اس آدمی کو جافنا لے جا رہے ہیں۔''

ایک چیخ اس کے اندرون میں دور تک دائرے بناتی چلی گئی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور ہر چیز اسے گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ اتنی دیر فون میں بھی سیٹی بجتی رہی، پھر آواز کٹ گئی اور اس کا ذہن ماؤف، بدن پسینے میں تر، سرد، بے جان۔

اگر یہ واقعی دیوی ناتھن تھا تو اب اس کی واپسی ناممکن ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سماجی سیاسی کھیل کی یہ چالیں مجھے کسی ایسی سیڑھی پر لے آئیں گی جہاں سے

سیڑھی سامنے تھی، اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی۔

ای میل پر اس کے پیغامات نے کئی کا میل باکس بھر دیا تھا لیکن جواب میں اس کی طرف سے کلک بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔

سوامی پرمانند کے آشرم سے جواب آیا کہ انھوں نے کیلاش پربت پر کہیں سمادھی لے لی ہے اور راجما چاہے تو آشرم کی ایک بھگتی ماتا کی حیثیت سے اُدھر دکشن میں اپنا آشرم چلا سکتی ہے۔

''وہ مال کیا ہوا جو جنگل والے نے ادھر بھیجا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''راستے میں چوری ہو گیا۔'' کسی نے کہا اور ''جے ماتا کی'' کہہ کر سلسلہ کاٹ دیا۔

اندھیرے میں گم ہوتی سیڑھی پر اچانک اوہارا نمودار ہوا اور دوسری ہی پل پھر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

''ممبئی سماچار'' نے لکھا تھا کہ چالیوں میں رہنے والے مزدوروں، فٹ پاتھ کے کباڑیوں اور کچرے سے پیٹ بھرنے والوں کی نیتا پشپا تائی نگر کو تین دن پہلے وی ٹی سب وے سے یا مہانگر پالیکا کے کسی گیٹ سے یا ڈھولکیا چوک میں ستھار کالونی سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کی وجہ

معلوم نہیں۔ نگر کر میڈم مہانگر پالیکا کے چوتھے درجے کے ملازموں کی مانگیں منوانے کے لیے اُپوشن کرنے والی تھیں۔ اخبار نے مزید یہ بھی لکھا تھا کہ میڈم نے شہری وکاس منتری شری وامن راوگھورپڑے کے بیٹے چمن راوگھورپڑے کے ایک بڑی کھادیہ پدارتھ گھوٹالے کا پردہ فاش کیا ہے، اس تعلق سے راجیہ سرکار کے پکش وپکش دونوں کے نیتا ان پر دباو ڈال رہے ہیں کہ اس گھوٹالے سے الگ لیکن کھادیان پوروٹھا کے ایک آفیسر کو اس میں شامل بتائے کہ اس کا نام بھی چمن راوگھورپڑے ہے۔

پریل جھونپڑپٹی کی شیوسینا شاکھا کے دو پنے والے اخبار ''نگاڑا'' نے کارپوریٹر پشپانگر کر کی جیون لیکھا چھاپی تھی کہ کس طرح پلے ہاؤس ایریا کی ایک رنڈی ممبئی کے مقامی راجکارن میں حصے دار بن گئی۔ اس جیون لیکھا میں مزدور یونین کے ایک سرگرم رکن ایل کے ساونت اور کارپوریٹر پشپانگر کر کے تعلقات پر کئی تصویروں کے ساتھ چٹخارے دار واقعات بھی چھاپے گئے تھے اور ہپٹے والوں، صفائی کامگاروں، ہاتھ مجوروں اور فٹ پاتھ پر دکانیں لگانے والوں کو لتاڑا گیا تھا کہ یہ لوگ گرے پڑے چرتر والوں کو کارپوریشن میں بھیج کر اپنے قیمتی ووٹ برباد کرتے ہیں۔

پروفیسر جگموہن ورما نے تیسرے اخبار میں بھی پشپانگر کر کے تعلق سے ایسی ہی کچھ باتیں دیکھیں۔

''میں نے تو ایک خبر کے انوسار راجکارن میں ہونے والے گھوٹالے پر کہانی ختم کر دی تھی۔'' اس نے سوچا۔

''کہانی ختم ہو جاتی ہے'' اس نے پھر سوچا، ''لیکن حقیقت باقی رہتی ہے۔''

''اور حقیقت باقی رہے'' وہ سوچتا رہا، ''تو اس سے نئی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔''

کوڈے پورم کی مہارانی سندری راجما لنگپا نے پڑوسی راجیوں کے مکھیہ منتریوں، صنعت کاروں، سماجی کاریہ کرتاؤں اور بہت سے دوسرے اثر انداز لوگوں سے رابطہ کر کے سندری دیوی ناتھن کو راجپتن کے چنگل سے چھڑانے کی کوششیں کر ڈالیں۔ اس نے اپنی پارٹی

کے تمام پداد ھکاریوں سے ملاقاتیں کیں۔ ذاتی غیر ذاتی تمام وسائل برت لیے لیکن جنگل والے سے سمپرک میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ رہ رہ کر ایک آواز اس سے کہہ رہی تھی کہ ہم اس آدمی کا جا فنا لے جا رہے ہیں۔

اندھیرے میں گم ہوتی سیڑھی پر وہ پھر راجا کو نظر آیا، اندھیرے میں گم ہوتا ہوا جیک آف آل ٹریڈ

کچھ عرصے بعد

وہ ہر قسم کے انسانی سماجی رشتوں کو تیاگ چکی تھی، وقت سے ہاری ہوئی، نڈھال، مجبور، بے کس کہ ایک صبح اسے اندھیرے میں گم ہوتی سیڑھی پر

میلے کچیلے خاکی کپڑوں میں وہ سیڑھیوں پر پڑا تھا:

سندری دیوی ناتھن، کچھ زندہ، کچھ مردہ

اس کی جیب سے ایک چٹھی نکلی جس پر لکھا تھا:

''شکریے کے ساتھ واپس''

چھوٹیا دادا کولی واڑے پہنچا تو آس پاس سے دو چار چھوکرے اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

''کُٹھے آ ہے رے مال؟''

''اُدھر دادا، گوڈاؤن میں۔''

''چل بتا۔''

کیچڑ سے بھری گندی گلی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اینٹیں رکھ کر چلنے والوں کے لیے راستہ بنا ہوا تھا۔ خود کو بیلنس کرتے وہ گلی کو پار کر گئے۔ جھونپڑیوں کے پیچھے سامنے دور تک کسی کھاڑی کا گندا کنارا پھیلا ہوا تھا۔ ہیں لکڑی کے تختے جوڑ کر کھڑا کیا گیا ایک احاطہ نظر آیا جس پر ٹن کا چھپر۔

ایک لڑکا دوڑ کر پھاٹک کھولنے لگا۔

''آؤ دادا'' پھر وہ پلٹ کر چھوٹیا سے بولا۔

چھوٹیا ناک پر رومال رکھ کر احاطے میں داخل ہوا۔ اندر جگہ جگہ مچھلیوں کے ٹوکرے ایک پر ایک ڈھیر کیے پڑے اور چھپر کو سہارنے والے ستونوں سے جال بندھے یا لٹکے ہوئے تھے۔

''وہ'' لڑکے نے احاطے کے بیچ پڑی ایک لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر رسّی کا ایک لچھا اِدھر اُدھر لٹک رہا تھا اور کرسی کے پایوں سے لگ کر ٹاٹ کا ایک منہ بند تھیلا پڑا ہوا تھا۔

''اس پر کھون کیسے دِکھ رہا رے؟''

''مچھی بھوت کھون والی تھی، دادا''

''ایسا کر'' چھوٹیا اسے سمجھانے لگا، ''یہ تھیلا دوسرے بڑے پلاسٹک بیگ میں پیک کر، رنگ دِکھنا نئیں منگتا۔''

''کر دیتا دادا'' کہہ کر لڑکا ایک گوشے میں رکھے ہوئے تھیلوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود بھی چھوکروں نے اس کام میں ہاتھ لگایا۔

''ٹھیک ہے'' چھوٹیا نے کام ختم ہوتا دیکھ کر کہا، ''یہ مال کی ڈیلیوری آج ہو جانا منگتا۔''

''لانچ کھاڑی میں آ گئی ہے، دادا، بولو تو ابھی پہنچا دیتے۔''

''کچھ بھی کرو، پن آج یہ کھیل مجھے کھتم منگتا۔''

کھیل ختم نہیں ہوا
کیونکہ حقیقت باقی ہے
اور حقیقت باقی رہے
تو اس سے نئی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں
سانپ اور سیڑھی کھیلتے ہوئے
یگ بیت گئے ..... بیتے جا رہے ہیں۔

(جاری)